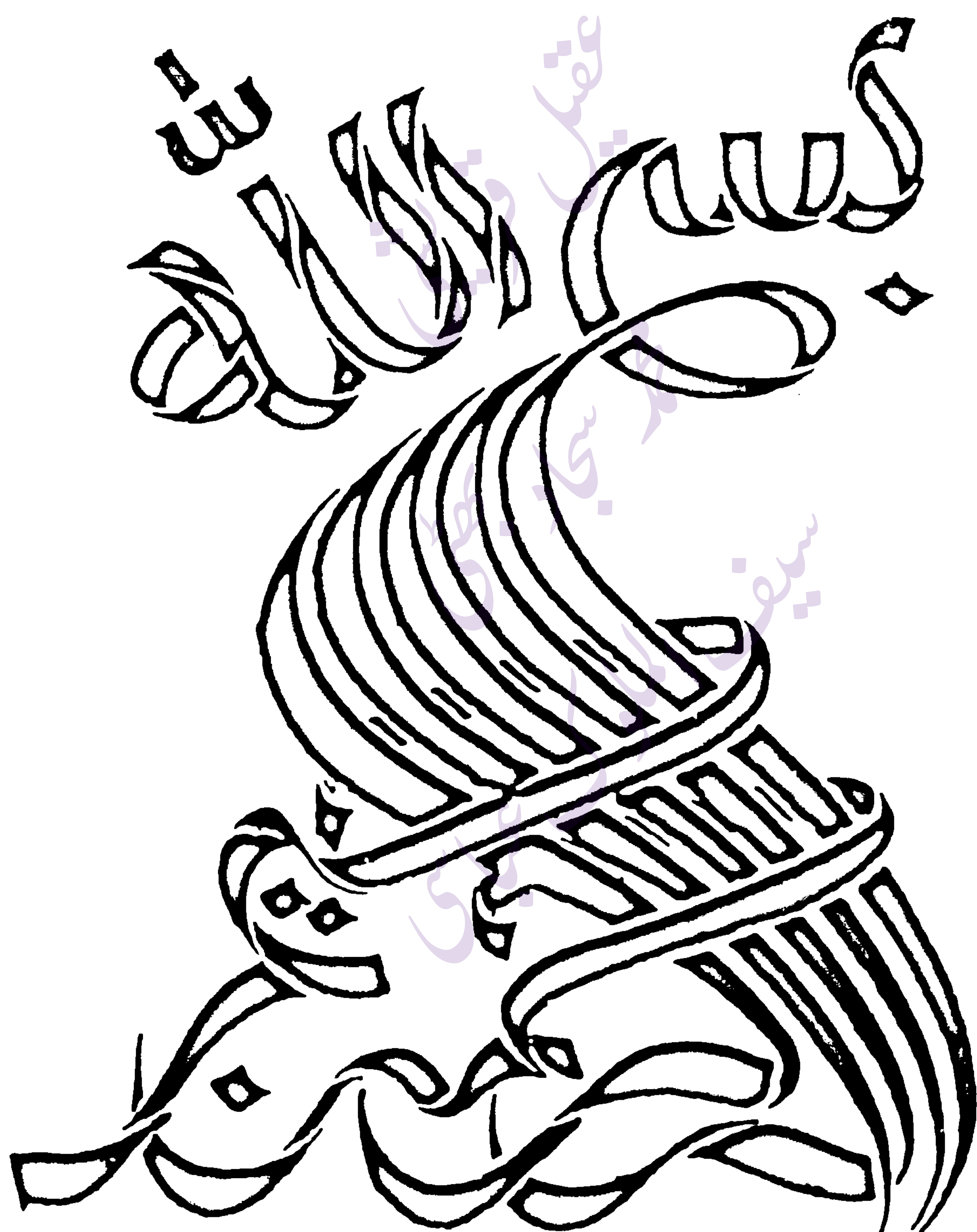
جہنم کی دسویں گہرائی

مُصنّف : رزاق ہیکنووک

مترجم : امجد اسلام امجد



جہنم کی دسویں گہرائی

بوسنیا کے عقوبت خانوں کے شب و روز

مُصنّف

رزاق ہیکنووِک

مُترجم

امجد اسلام امجد

برَائٹ بُکسؔ

چوک صفانوالہ 43۔ مزنگ روڈ لاہور فون 6374873

ناول ملکیت و بشکریہ

محمد سعید چوہدری

ناول

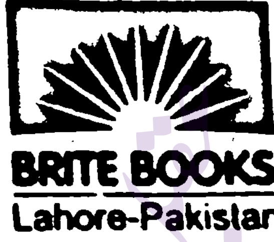
سکین

بائے

محمد سجاد بھٹی

0
3
0
4
5
5
0
3
0
8
6

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن



نام کتاب .... جہنم کی دسویں گہرائی

مصنف .... رزاق ہیکھووک

مترجم .... امجد اسلام امجد

باراول .... مئی 1999

ناشر .... اے۔ایم۔شکوری

پبلشر .... برائٹ بکس۔لاہور

پرنٹر .... سن فلاور پیجز پرائیویٹ لمیٹڈ۔لاہور

سرورق .... نعیم فراز۔یونائیٹڈ آرٹس۔گنپت روڈ۔لاہور

کمپوزنگ .... آئیڈیل کمپوزنگ پوائنٹ،اچھرہ شاپنگ سنٹر،لاہور۔

ڈسٹری بیوٹر .... الفیصل ناشران و تاجران کتب،
غزنی سٹریٹ، اردو بازار۔

قیمت 175/-

فہرست مضامین

انتساب

شہید پاکستان

حکیم محمد سعید

کے نام

جو بوسنیا کے عوام سے دلی محبت اور ان کے مسائل کے حل کے لئے عملی طور پر مصروف کار رہے اور جنہوں نے پاکستانی نونہالوں کے ساتھ بوسنیا کے ان بچوں کو مدینہ الحکمت کراچی میں لا کر بسایا۔ جو اپنے والدین سے محروم ہو گئے تھے۔ اس طرح شہید پاکستان نے ان بوسنیائی بچوں کو جہنم کی گہرائیوں میں گرنے سے بچالیا۔

مقدمہ

اکتوبر 1997ء کا واقعہ ہے کہ میں نے حکیم محمد سعید سے بات کی کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہونا چاہئے۔ انہوں نے پوچھا کون سی کتاب؟ میں نے کہا ایک شخص نے جہنم سے واپس آنے پر کتاب لکھ ڈالی ہے۔ یوں اس مشن کا آغاز ہوا اور حکیم محمد سعید نے کتاب "جہنم کی دسویں گہرائی" کے ترجمے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میرے اور حکیم صاحب کے مشترکہ محرکات یہ تھے کہ بوسنیا کے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے گئے ہیں ان کا علم اردو زبان لکھنے اور پڑھنے والوں کو عمومی طور پر اور پاکستانیوں کو خصوصی طور پر ہونا چاہئے اور مزید یہ کہ انسانی حقوق کے معاملے پر مغربی مالک کے دوغلہ پن کو ایکسپوز کیا جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر پاکستان 1947ء میں نہ بن چکا ہوتا تو 1997ء میں اسی طرح تاریخ کی کوکھ سے جنم لے رہا ہوتا جس طرح بوسنیا ہرزے گونیا کی مملکت وجود میں آئی اور جو اس وقت یورپ میں اپنے بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ مزید یہ کہ ہم یہ آزادی آئینی جنگ کے نتیجہ میں نہ حاصل کر سکتے جیسے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی فراست سے ایک گولی چلائے بغیر مسلمانوں کو دوہری غلامی سے نجات دلا دی تھی۔ بلکہ ہم بھی اس قسم کی بربریت اور ظلم کا نشانہ بنے ہوتے جس قسم کی ہولناک اور انسانیت سوز بربریت اور نسل کشی سے بوسنیا کے مسلمان دوچار ہوئے۔ میرے تجزیہ کے مطابق بوسنیا کی مسلم مملکت یورپ کا پاکستان ہے' اس مماثلت نے بھی مجھے تحریک دی کہ میں اس کتاب کے ترجمہ اور اس کی اشاعت کی کوشش کروں۔

یہاں ایک ایسے انوکھے اور منفرد ردعمل کا ذکر کرنا مناسب ہو گا کہ جس نے ایک امریکی شہری کو اس لئے اسلام کی جانب مائل کر دیا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بوسنیا کے مسلمانوں پر مظالم ہوتے دیکھے۔ امریکی صدر جارج واشنگٹن کے نام سے تو سب واقف ہیں لیکن ان کے پڑپوتے جارج اشقون کو امریکہ کے صحافی حضرات تو جانتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں کم لوگ ہی ان سے واقف ہوں گے۔ جارج اشقون نے بیروت' سوڈان اور افغانستان میں خانہ جنگی کے دوران اپنے کیمرے سے تباہی اور بربادی کے مناظر اور انسانی دکھوں کی تصاویر اتاریں جو وہاں امریکہ میں چھپتی رہی اور مقبول ہوئیں۔

جارج اشقون کو صحافی کی حیثیت میں بوسنیا بھی جانے کا موقعہ ملا اس نے وہاں جو بربریت اور انسانیت سوز مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے باوجود بوسنیا کے مسلمانوں کی اپنے مذہب سے عقیدت اور لگاؤ دیکھا تو اس نے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرنی شروع کی۔ بوسنیا میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے دوران اس نے مسلمان خاندانوں کی انسانیت کے ناطے جہاں ممکن ہوا مدد کرنی شروع کی۔ اسی سلسلہ میں وہ ایک مسلمان خاندان کو امریکہ بھجوانے میں بھی کامیاب ہوا۔ لیکن بوسنیا میں فرائض انجام دینے کے دوران باقاعدگی سے اس خاندان کی خیریت دریافت کرتا رہا' اس خاندان کے سرپرست کینسر کے مریض تھے۔ اپنے خطوط میں اشقون خصوصاً" اس کے متعلق دریافت کرتا رہا۔ اسے یہ بات بڑی عجیب لگتی تھی کہ مکمل عافیت اور مغربی ماحول میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود کینسر سے عاجز اس بزرگ نے مسجد جا کر نماز جمعہ ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب جارج اشقون امریکہ واپس لوٹا تو دوسرے ہی دن بوسنیا کے اس بزرگ شہری کا انتقال

ہو گیا۔ اب اگلی داستان جارج اشقون کی زبانی سنیں۔ "میں تیزی سے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ہم سے پہلے اس شہر میں موجود مسلمانوں کی بڑی تعداد تجہیز و تکفین کے لئے پہنچ چکی تھی جو بھارت' پاکستان' سعودی عرب' کویت اور دیگر اسلامی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے اور وہ سب اس طرح اس جنازہ میں شریک تھے جیسے یہ ان کے بزرگ اور فرد خاندان سے ہوں۔ میرے لئے یہ نئی بات تھی جب میرے مرحوم بوسنی دوست عثمان کے جسم کو غسل دیا جا رہا تھا' میں نے عین اس وقت کلمہ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام لے آنے کا اعلان کر دیا"۔

مجھے یقین ہے کہ جنم کی دسویں گہرائی کو پڑھ کر بہت سے پاکستانی دوبارہ پاکستان کی اہمیت پر ایمان لے آئیں گے۔

بوسنیا ہرزے گونیا کی مختصر تاریخ یوں ہے کہ 1643ء صدی عیسوی میں عثمانیوں نے بوسنیا میں اسلامی پرچم لہرایا' اس وقت اس علاقے کا نام (بوسنیا پاشا لوک) رکھا گیا اور یوں بوسنیا میں اسلامی تہذیب نے جڑ پکڑنا شروع کر دی' بوسنیا میں دنیا کی سب سے خوبصورت مساجد تعمیر ہوئیں جن میں غازی بیگ کی مسجد جسے سراجیو میں 1530ء کے لگ بھگ تعمیر کیا گیا شامل ہے' ان مساجد کو اور دیگر اسلامی تعمیرات کو دیکھنے کے لئے دور دور سے سیاح آیا کرتے تھے۔ جب خلافت عثمانیہ زوال پذیر ہوئی تو یورپی قوتوں نے اسے دوبارہ فتح کرنے کا پروگرام بنایا۔ 1878ء میں برلن میں فوجی سربراہوں کے اجلاس میں طے پایا کہ آسٹریا کی حکومت کو بوسنیا کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے لئے مدد دی جائے۔ بالآخر 1906ء میں بوسنیا آسٹریا کی وسیع مملکت کا حصہ بنا دیا گیا۔ بعد کی سیاسی تبدیلیوں کے نتیجہ میں یوگوسلاویہ فیڈریشن 1933ء کو معرض وجود میں آئی تو 1945ء میں آسٹریا سے علیحدہ ہو کر بوسنیا ہرزے گونیا یوگوسلاویہ

فیڈریشن کا 1945ء میں باقاعدہ ممبر ہو گیا۔

یہ صورت حال 1990ء تک قائم رہی۔ بوسنیا کے مسلمان اکثر ڈاکٹر' وکیل' تاجر اور سرکاری ملازم تھے اور نہایت مہذب اور شائستگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مارشل ٹیٹو نے اپنی عسکری قوت کے لئے سرب نسل پر انحصار کیا۔

1990ء کی ابتدا میں یوگوسلاویہ کا وفاق منتشر ہوا تو سب سے پہلے سلونیا اور کروشیا نے اعلان آزادی کر دیا' اس کے بعد 6 مارچ 1992ء کو ایک ریفرنڈم کے ذریعے بوسنیا ہرزے گوینا نے بھی علیحدگی کا اعلان کیا اور انہوں نے امریکن طرز کے صدارتی نظام کا آئین تشکیل دیا 6 اپریل 1992ء کو یورپین یونین نے بوسنیا کی علیحدہ حیثیت تسلیم کر لی لیکن اس سے دو دن قبل سرب کی فوجیں جو دراصل یوگوسلاویہ کی فیڈرل فورسز پر مشتمل تھیں اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھیں بوسنیا کی سرزمین میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد ہی ان مظالم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جسے سرب درندے "نسلی صفائی" (Ethinic Cleanising) کا نام دیتے رہے لیکن جو فی الحقیقت بدترین قسم کی نسل کشی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بوسنیا ہرزے گوینا کو 18 اپریل 1992ء کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اور بعدازاں اقوام متحدہ نے بھی ایک علیحدہ مملکت کے تسلیم کر لیا تھا اور یوں اقوام متحدہ میں شامل تمام قومیں بوسنیا ہرزے گوینا کی بروقت امداد اور اس پر بیرونی جارحیت روکنے کی ذمہ دار تھیں۔

بوسنیا کے مسلم ڈیمو کریٹک پارٹی (SDA) کے قائد علیجا عزت بیگووچ بوسنیا کے صدر منتخب ہوئے' انہوں نے اعلان کیا کہ مملکت کی صدارت باری

باری مسلمان، کروٹ اور سرب کے درمیان رہے گی۔ یہ اعلان کثیر القومیت کو یکجا رکھنے اور برابر کا حق دینے کی ضمانت تھا۔

یہ بتانا ضروری ہو گا کہ سرب فوجیں بوسنیا میں کیوں داخل ہوئیں۔ دراصل بوسنیا کے کچھ علاقے ایسے تھے جہاں سرب نسل کے لوگ آباد تھے۔ سرب حکومت کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کر کے اسے اپنے حصے میں شامل کر لیا جائے، وہ عظیم سربیا کا نعرہ لگاتے تھے اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جتنے علاقے پر سرب فوجوں کا قبضہ قائم ہو جائے وہاں "کوئی مسلمان زندہ نہ چھوڑا جائے" وہ اپنے عظیم سربیا کو مسلمانوں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے اور اپنی اس حکمت عملی کو انہوں نے نسلی صفائی کا نام دیا۔

جس وقت یوگوسلاویہ کی فیڈریشن ٹوٹی تو سارا فوجی اسلحہ جو بلغراد میں موجود تھا، اس پر سرب افواج نے (کیونکہ بلغراد سربیا میں آتا تھا) قبضہ کر لیا لیکن اس کے فوراً بعد اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے سربیا وفد کی درخواست پر سابقہ یوگوسلاویہ کے کسی بھی علاقے میں ہتھیاروں کی سپلائی پر پابندی لگا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوسنیا کے لوگ نہتے اور بغیر ہتھیار کے سرب افواج کی جارحیت کا نشانہ بنے۔ عظیم سربیا کا نعرہ لگانے والے وحشی سرب درندے ٹینکوں پر چڑھ کر نہتے بوسنیا کے مسلم علاقوں میں داخل ہو گئے۔ اس موقع پر سربوں کے کمانڈر راتکو ملاڈچ (Ratko Mladc) نے اعلان کیا کہ بوسنیا کی سرزمین میں جہاں جہاں بھی سرب موجود ہیں وہ عظیم سربیا کا حصہ ہیں اور ان علاقوں میں وہ شخص جو مسلمان ہے زندہ نہیں رہ سکتا پھر اس نے کہا "یہ لوگ اللہ بڑا ہے کا شور مچاتے ہیں ہم ان کو "بڑے" کے پاس پہنچا دیں گے" اپنی تقریر کے آخر میں اس نے کہا "ان کی عورتیں

بہت بچے جنتی ہیں اب وہ سرب بچے پیدا کریں گی"۔

ان حالات میں بوسنیا کی مسلم آبادی نے اپنی نئی ریاست کی مدافعت کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا تو یہ فیصلہ جرم قرار پایا اور اس جرم کی سزا نہتے شہریوں کو بلاتخصیص دی گئی جس میں بوڑھے' جوان' بچے' عورت' مرد' پروفیسر' کاشتکار' ملازم پیشہ یا دوکاندار سب شامل تھے۔

مجھے مئی 1998ء جرمنی کے ایک ادارے کی جانب سے ایک کانفرنس میں شمولیت کے لئے بلایا گیا جس کا موضوع مستقل بین الاقوامی عدالت برائے انسداد عالمی تشدد کا قیام تھا۔ اس کانفرنس میں بوسنیا اور افریقہ کی ریاستوں کا اکثر ذکر آیا جہاں کہ سیکورٹی کونسل نے عارضی طور پر ان ملزمان کے خلاف کارروائی کے لئے عدالتیں قائم کی ہوئی ہیں جنہوں نے بوسنیا اور رونڈا میں انسانیت سوز جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ میں نے اس کانفرنس سے جمہوریہ بوسنیا ہرزے گونیا کی 20 مارچ 1993ء کی اس درخواست کا متن حاصل کیا جو مملکت بوسنیا کی جانب سے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں پروفیسر فرانس اے بوئیل (Francis A Boyle) نے داخل کی تھی اور اس میں انہوں نے 1948ء کے بین الاقوامی کونشن برائے انسداد نسل کشی کے تحت سربیا کی حکومت اور ان کے فوجی سربراہ و دیگر سرب ملزمان کے خلاف جنہوں نے بوسنیا میں جہنم کی کیفیت پیدا کر دی تھی مقدمہ چلانے کی درخواست کی تھی۔

اس درخواست میں وہ واقعات درج ہیں کہ ان کا سننا بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے نازی جرمنی پر بہت کچھ پڑھا ہے۔ یہودی مصنف اور اکثر مغربی دانشور یہودیوں پر کیئے ہوئے مظالم کا بہت پرچار کرتے رہتے ہیں لیکن بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے۔ اس کی ماضی میں کوئی

مثال نہیں ملتی۔ بوسنیا میں ظلم اور برائی (Evil) کی ایک نئی تاریخ لکھی گئی ہے۔

مثلاً" نازی جرمنی میں کسی یہودی کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے ساتھی یہودی کے "مردانہ اوصاف" کو اپنے دانتوں سے کاٹ کر یہ ثابت کرے کہ وہ خود یہودی نہیں ہے تو اس کی جان بخشی ہو گی .... لیکن یہ دل چسپ کھیل سرب فوجی اکثر بوسنیا کے قیدی مسلمانوں سے کرواتے اور پھر مردانہ اوصاف سے محروم مرد کو زندہ چھوڑ دیتے اور دوسرے کو "بڑے" کے پاس پہنچا دیتے۔

نسل کشی کے خلاف کنونشن سال 1948ء (Genocide Convention) کے آرٹیکل 2 میں جرم نسل کشی کی تعریف درج ہے۔ اس کی رو سے ایسے اقدامات کرنا جس کا مقصد کسی قوم، نسل یا مذہبی گروہ کو ختم کرنا ہو اور اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انسانوں کا قتل کرنا یا ایسے حالات پیدا کر دینا کہ عام زندگی ناممکن ہو جائے یا ان کو جسمانی تشدد کا تسلسل سے نشانہ بنائے رکھنا شامل ہے۔ میں اس کنونشن کے پس منظر اور تفصیل میں نہیں جاتا کہ کس طرح دوسری عالمی جنگ کے ہولناک واقعات اور نازی جرمنی میں ایک نسل کو ریاستی دہشت گردی کا نشانہ بنایا جانے کی وجہ سے عالمی ضمیر بیدار ہوا اور 1948ء میں نسل کشی کو روکنے کے لئے تدابیر کی گئیں۔ لیکن بوسنیا ہرزے گونیا کی 138 پیراگراف پر مشتمل درخواست جو بین الاقوامی عدالت میں پیش کی گئی اس میں سے چند واقعات قدرے اختصار سے بیان کرنا چاہوں گا۔ جو درج ذیل ہیں۔

پیراگراف نمبر 33 میں ان ہزاروں مساجد کی تباہی کی تفصیل دی گئی ہے جن کو سرب فوجوں نے خصوصی طور پر شہید کیا۔ ان میں وہ مساجد بھی تھیں

بنو چودھویں اور پندرہویں صدی میں بنائی گئی تھیں۔ جس میں غازی بیگ اور علی پاشا کی مشہور مساجد بھی شامل ہیں۔ کئی مساجد کو ڈینامیٹ اگا کر اور بلڈوزر استعمال کر کے ان کا نشان تک مٹا دیا گیا۔

پیراگراف (c)44 میں ایک 65 سالہ خاتون کے ساتھ زنا بالجبر اور ان کے قتل کی دردناک داستان درج ہے۔

پیراگراف (G)44 میں کئی تشدد کے واقعات درج ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بوسنیا کے ایک قصبہ کے مسلمانوں کو زمین پر لٹا کر ان کے اوپر سے مال سے لدے ہوئے وزنی فوجی ٹرک گذار دیئے گئے اور ان میں سے جو بچ رہے وہ ساری عمر کے لئے "عبرت" بن کر رہ گئے۔

پیراگراف (J)44 میں درج ہے کہ ایک سرب فوجی اس بات پر ناز کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی گردنیں بڑی صفائی سے اپنے شکاری چاقو کے ذریعے کاٹنے میں ماہر ہے۔

پیراگراف 49 میں درج ہے کہ یورپین کونسل نے اپنے طور پر جو شہادتیں جمع کی ہیں ان کی روشنی میں وہ اس حتمی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زنا بالجبر کو بطور سیاسی ہتھیار کے استعمال کیا گیا اور پیراگراف 54 میں اس کے ثبوت میں ان 150 مسلم حاملہ خواتین کا ذکر ہے جنہیں سربیا کے فوجیوں نے اپنے کیمپوں میں رکھا ان سے زنا بالجبر کیا اور پھر ان کو اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک کہ ان کے شکم میں بچہ اس عمر تک نہ پہنچ گیا کہ اگر اسے وہ ضائع کرنا چاہتیں تو ضائع نہ کر سکیں۔

پیراگراف 63 میں 33 سالہ مسلمان عورت کے ساتھ زنا بالجبر جو اس کی بارہ سالہ بیٹی کے سامنے یہ کہہ کر کیا گیا کہ "تم بھی یہ کام سیکھ لو" اور پھر اس

بارہ سالہ بچی کے ساتھ متعدد بار زنا بالجبر کیا گیا۔

پیراگراف (F)68 میں سترہ (17) سالہ مرینا کی دردناک داستان ہے کہ کس طرح ہر روز اسے دس سرب فوجیوں کا ہوس پورا کرنے کے لئے پیش کیا جاتا۔

درخواست کے دیگر پیراگرافس میں بہت سارے "حراست کیمپوں" (Detention Camps) کی لرزہ خیز داستانیں مکمل اسناد اور شہادت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ جہنم کی دسویں گہرائی رزاق بیکونوچ کی زندگی کے ان تلخ دنوں کی داستان ہے جب رزاق سربوں کی قید میں ہر روز موت اور زندگی کی کشمکش سے گذرتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ان ناقابل بیان مظالم کو دیکھا جو سرب درندے مسلمان مردان اور عورتوں کے ساتھ کیا کرتے تھے رزاق کی کتاب اس بربریت کی تاریخ وار شہادت ہے۔

رزاق 30 مئی 1992ء کو بوسنیا کے ایک چھوٹے سے قصبہ سے اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ وہ اور اس کے قصبہ کے باقی مسلمان بوسنیا کی آزادی کے خواہاں تھے اور عظیم سربیا کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مردوں کو اس ایک جرم میں گرفتار کر کے محبوس خانوں میں روانہ کر دیا گیا۔ ان میں سے بہت سارے تو مر گئے یا مار دیئے گئے۔ رزاق سخت جان ثابت ہوا اور قید و بند کی تمام صعوبتیں اٹھانے کے باوجود زندہ رہا۔ 13 نومبر 1993ء کو ریڈ کراس کی وساطت سے آزاد ہو کر ناروے پہنچا۔ جہاں اپنی نیم مردہ حالت سے افاقہ آنے پر اس نے اپنے قید کی داستان لکھ ڈالی۔

اگر یہ کتاب کسی یہودی' عیسائی یا مغربی ملک کے باشندے کی لکھی ہوتی تو اسے بین الاقوامی پذیرائی ملتی۔ میں نے این کی ڈائری (Ann's Diary)

پڑھی ہے جو کہ ایک یہودی لڑکی نے ہالینڈ میں نازی جرمنی کے تسلط کے دوران اپنے تاثرات بیان کرنے کے انداز میں لکھی ہے' یہ کتاب یا ڈائری نصف صدی ہو جانے کے باوجود ابھی تک مشہور تصانیف (Best Seller) کے طور پر فروخت ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے زیلٹا کی ڈائری (Diary Zelta's) کا مطالعہ بھی کیا ہے' یہ عیسائی بچی سراجیئیو میں سربوں کے محاصرہ کے دوران رہی اور اس نے سراجیو کے شہریوں کی مشکلات اور ڈر و خوف کا ذکر ڈائری کی صورت میں کیا ہے۔ زیلٹا اس وقت امریکہ جا چکی ہے اور وہاں اس کے ٹی وی نیٹ ورک پر انٹرویو کئے گئے ہیں۔ رزاق کی کتاب تفصیلات کے لحاظ سے ان دونوں کتابوں سے کہیں بہتر ہے۔ اس کتاب میں فلسفہ زندگی کے کئے ایسے پہلو اجاگر ہوئے ہیں جو صرف وہی بیان کر سکتا ہے جس نے ظلم اور دکھ کی انتہا خود دیکھی اور سہی ہو اور انسان کی قوت مدافعت کی معراج بھی دیکھی ہو۔ اس کے باوجود رزاق کی کتاب کو وہ پذیرائی نہیں مل سکی۔

رزاق بیکونوچ جہنم کی ایک گہرائی سے دوسری میں جاتا رہا' اس نے جہنم کی دسویں گہرائیوں میں خود رہ کر دیکھا کہ انسان کتنا درندہ ہو سکتا ہے' وہ کئی قسم کے جسمانی اور روحانی دکھوں کو لحہ بہ لحہ جھیلتا رہا' وہ خوف کو اپنے جسم اور روح کے قریب تر پاتا تھا۔ موت ہر لحہ سستی تھی۔ غیرت نام کی کوئی صفت نہ رہ گئی تھی نامعلوم ڈر تھا جو کئی ظلمتوں کے ساتھ گھیرا ڈالے ہوئے تھا۔ چونکہ خود شاعر اور صحافی تھا اس لئے حساس بھی تھا۔ یہ وہی لکھ سکتا تھا " ایک ایسی بھیانک رات آگئی کہ ہم میں سے کئی ایک نے خدا سے بھی بغاوت کر دی" زندہ رہنے کے لئے بہانے تلاش کرتا ہے تو یہ کہہ کر سہارہ لیتا ہے " کیمپ میں ہم سب اپنے دکھ اور تکلیف کی وجہ سے ایک برابر ہو گئے تھے"۔

خاموشی پر عجب تبصرہ کرتا ہے کہ "سربوں نے خاموشی پر بھی اختیار حاصل کیا ہوا تھا۔ جب چاہتے رات کی خاموشی میں کسی قیدی کو کیمپ سے باہر بلا کر اس پر تشدد کرنا شروع کر دیتے اور پھر خاموشی چاک چاک ہو جاتی' صرف دردناک چیخوں سے فضا بھر جاتی"۔

بوسنیا کے مسلمانوں کی حیرت انگیز قوت مدافعت اور ان کے استقلال پر تاریخی شواہد اور علمی تحقیق کی جانی چاہئے کہ کس طرح نیٹو کے کمانڈر انچیف کے اس اعلانیہ پالیسی کے باوجود کہ وہ یورپ میں مسلم مملکت قائم نہیں ہونے دیں گے' اور کس طرح برطانیہ کے وزیراعظم کی اس عملاً دھمکی کے ہوتے ہوئے کہ بوسنیا کی اسلامی شناخت ان کے لئے ناقابل برداشت ہے اور کس طرح دنیا کی دوسری بڑی طاقتوں روس کو اپنے پرانے حلیف سربیا اور سرب افواج کی کھلم کھلا حمایت' ہلہ شیری اور اسلحہ کے خفیہ انبار دینے کے باوجود بوسنیا کے مظلوم شہریوں نے جدید اسلحہ کی غیر موجودگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جنگ جاری رکھی اور ہمت نہ ہاری۔ بالاخر مغرب نے شرمندہ بوسنیا ہرزے گونیا کی جیت مان لی۔

لیکن غور کریں کہ بوسنیا کا معاشرہ کیسی شکست اور ریخت سے دوچار ہوا۔ ایک واقعہ ہی پوری داستان واضح کر دے گا۔ جو کہ بوسنیا کی اعلیٰ عدالت کی خاتون جج کی داستان ہے۔ یہ پڑھی لکھی مہذب اور دانشور خاتون جہنم کی گہرائیوں میں سے لٹتی پٹتی مہاجر کیمپ تک پہنچی تو کچھ مغربی مبصرین اس کا انٹرویو کرنے اس کے پاس پہنچے۔ دوچار سوالات کا جواب دینے کے بعد اس خاتون کا دکھ بول اٹھا۔ اگلی کہانی اسی کی زبانی سنئے وہ کہتی ہیں:۔

"میری شخصیت اتنی مسخ ہو چکی ہے کہ اب جو تم میرا انٹرویو کر رہے ہو

اور سچائی کی تلاش میں نکلے ہو تو میں اندر ہی اندر یہ سوچ رہی ہوں کہ تم نے مجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی تو نہیں دی اور مجھ سے سوال پر سوال کر رہے ہو۔ مجھے اب سچ بتانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے سچ نہیں چاہئے۔ مجھے بھیک چاہئے"۔

جو پاکستانی حال میں بیرون ممالک گئے ہوں گے' انہوں نے یورپ کے ہر بڑے شہر میں بوسنیا کی مسلم عورتوں اور بچوں کو بھیک مانگتے دیکھا ہو گا۔ انہی حالات سے متاثر ہو کر حکیم محمد سعید نے چند بوسنیا کے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کا انتظام بھی کیا تھا جو کچھ حکیم صاحب نے اپنی حد تک کیا وہ مسلمانوں کے ان بادشاہوں اور صاحب ثروت امراء کو وسیع اور اداری بنیادوں پر کرنا چاہئے تھا کیونکہ فی الحقیقت یورپ کے شہروں میں دربدر پھرنے والے یہ خواتین اور بچے بھکاری نہیں ہیں وہ تو اس لئے بھکاری بنائے جا رہے ہیں تاکہ بوسنیا کی شناخت بگڑ جائے۔

میں بوسنیا ہرزے گونیا کے اس مقدمہ کی جانب پھر آنا چاہتا ہوں جو بین الاقوامی عدالت انصاف میں دائر کیا گیا تھا۔ اور جس کی تفصیل میں نے پہلے بیان کی ہے۔ اس مقدمہ میں ایک ایسا سوال اٹھایا گیا تھا جو ابھی تک جواب طلب ہے۔

صدر بوسنیا ہرزے گونیا نے اپنی درخواست میں بین الاقوامی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق نمبر 51 کا حوالہ دیا کہ اس کی روح سے اگر کسی مملکت پر جارحیت ہو اور اس کے علاقے اور شہری غیر محفوظ ہو جائیں تو اس مملکت کے تمام اداروں کو اور اس کے شہریوں کو "فردا فردا" اور اجتماعی طور پر اپنی مدافعت کرنے کا مکمل حق ہوتا ہے اور چونکہ بوسنیا

ہرزے گوینا اب بطور ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے اقوام متحدہ کا باقاعدہ ممبر تسلیم کیا جا چکا ہے تو ایسی صورت میں کہ بوسنیا پر کھلم کھلا جارحیت کر دی گئی ہے تو اسے اپنی مدافعت کے لئے بیرون دنیا سے ہتھیار حاصل کرنے پر کیوں پابندی لگائی گئی ہے؟ اس سوال کا آج تک جواب نہیں دیا گیا!

اسی سوال کو پروفیسر فرانسیس اے بوئیل نے بحثیت اٹارنی بوسنیا ہرزے گوینا انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں یکم اپریل 1996ء کی نشست میں ایک نئے حوالے سے اٹھایا۔ انہوں نے انسداد نسل کشی کنونشن مجریہ 1948ء کی مختلف شکوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بڑے ستھرے اور خوبصورت انداز مین ان تمام ملکوں سے جو انسداد نسل کشی کے کنونشن پر دستخط کر چکے تھے یہ دو ٹوک سوال پوچھا کہ جب اس کنونشن کے مطابق تمام دستخط کنندگان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بوسنیا کے خلاف اس جارحیت کو روکنے کے لئے جس جارحیت کا مقصد اور عندیہ نسل کشی ہے کہ وہ مظلوم کو ہر قسم کی اعانت مہیا کرے تو وہ یہ بتائیں کہ بوسنیا کو انہوں نے وہ محدود ہتھیار بھی کیوں مہیا نہ کیۓ جس سے کہ بوسنیا اپنے شہریوں کی حفاظت کر سکتا۔ اس سوال کا جواب عدالت کی ساری کارروائی میں کسی نے دینے کی کوشش نہ کی اور یوں یہ سوال بتکرار جواب طلب ہے۔

البتہ ڈاکٹر چندرا مظفر جو ملائیشیا کے ایک معروف دانشور اور جسٹ ورلڈ ٹرسٹ (Just world trust) کے عہدہ دار ہیں انہوں نے اس کتاب میں جو بوسنیا پر انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے فیصلوں پر مشتمل ہے اپنے دیباچہ میں ایک تلخ حقیقت لکھ ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"بوسنیا میں جس طرح مسلمانوں کو درندگی اور بربریت کے حوالے کر دیا

گیا اور ظالم اور مظلوم کی اس جنگ میں مغرب جس کھلم کھلا تضاد کا مرتکب نظر آتا ہے' اس سے پوری عالم اسلامی مغرب کے (انصاف پسندی کے) دعوؤں سے مکمل طور پر اور شاید ہمیشہ کے لئے ناامید ہو گئی ہے۔ بوسنیا کی روح پر لگائے ہوئے گہرے زخم پورے اسلامی جسم میں دیر تک اپنا اثر قائم رکھیں گے"۔

نیز اسی کتاب میں پروفیسر فرانس اے بوئیل جنہوں نے بڑے جذباتی انداز میں بوسنیا ہرزے گونیا کا مقدمہ لڑا تھا اپنے تاثرات دو جگہ قلمبند کئے ہیں۔ کتاب کی ابتداء میں ایک صفحے اور چند سطور کی مختصر پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں "بوسنیا کو تباہی کی کالی دیوی (Machi Avellain God) کے سامنے بڑی طاقتوں نے ایک قربانی کے طور پر پیش کر دیا اور خود تماشہ دیکھتے رہے .... اب یورپ میں امن اور انصاف کی بات بیکار ہے"۔

کتاب کے آخر میں بطور پوسٹ سکرپٹ (Post Script) پروفیسر فرانسیس ای بوائیل قرآن کی آیات کا حوالہ دے کر لکھتا ہے:۔

"بوسنیا ہرزے گونیا کے بہادر عوام کا مستقبل صرف اور صرف اللہ کے ہاتھوں میں ہے .... وہ اللہ ہی تھا جس نے انہیں اب تک ناقابل بیان حالات میں بھی قائم رکھا ...... بے شک اللہ عظیم ہے"۔

بوسنیا زندہ باد ...... پاکستان زندہ باد

ایس۔ ایم۔ ظفر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

پیش لفظ

طبع زاد تحریروں کے بارے میں "کیوں اور کیسے" قسم کے سوالات کا جواب بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ معاملے تخلیقی عمل کے ہیں جو آئس برگ کی طرح صرف 1/10 سطح پر نظر آتا ہے اور باقی کے سارے معاملات اسی دسویں حصے سے منسلک ظن و تخمین پر مبنی ہوتے ہیں البتہ ترجمے اور تالیف کے سلسلے میں "وضاحت اور ضرورت" کے حوالے سے گفتگو ہو سکتی ہے' سو میں بہت اختصار سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کتاب "جہنم کی دسویں گہرائی" کا ترجمہ میں نے کیوں کیا اور اس کام کے دوران مجھے کن غیر معمولی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

چند ماہ قبل محترم ایس ایم ظفر میرے پاس اس کتاب کے انگریزی ترجمے کے ساتھ تشریف لائے اور فرمایا کہ ان کی اور حکیم محمد سعید صاحب کی یہ مشترکہ خواہش ہے کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جائے اور یہ کہ یہ کام آپ کریں۔ کتاب کے بارے میں جو تفصیلات انہوں نے بتائیں اس کے پیش نظر میں نے ان کے اس فیصلے سے تو فوری اتفاق کیا کہ ایسی کتاب پاکستان اور دوسرے اردو خوان حلقوں میں یقیناً" پہنچنی چاہئے کہ بوسنیا اس وقت ملت اسلامیہ کے لئے ایک سے زیادہ حوالوں سے بے انتہا اہمیت رکھتا ہے مگر جہاں تک ترجمے کا معاملہ ہے میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ یہ بڑا

محنت اور صبر طلب کام ہے اور نثر سے ترجمے میں وہ آسانی اور رعائت بھی نہیں ہوتی جو شاعری کے ترجمے میں مل جاتی ہے کہ آپ شاعر کے مافی الضمیر کو بیان کرنے میں اس کے لکھے ہوئے لفظوں کے لفظی ترجمے کے پابند نہیں رہتے لیکن ظفر صاحب میری اس وضاحت کے باوجود اپنے اس خیال پر جمے رہے کہ یہ کام مجھی کو کرنا چاہئے اور سچی بات یہ ہے کہ کتاب کے موضوع اور اس کے عالم اسلام اور ضمیر عالم سے خصوصی تعلق کے باعث میرا دل بھی اس کے لئے ایک مخصوص کشش اور رغبت محسوس کر رہا تھا۔

اب جب ترجمے کے حوالے سے کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو عنوان ہی میں مشکل آ پڑی کہ انگریزی لفظ Circle کے جتنے مفاہیم لغت میں درج تھے ان میں سے کوئی بھی اس کے اس مفہوم کا احاطہ نہیں کر پا رہا تھا جس کا احساس کتاب پڑھ کر ہوتا ہے۔ دائرہ' گھیرا' کنڈل' حلقہ' چکر کسی لفظ پر بھی دل ٹک نہیں رہا تھا' مختار مسعود صاحب سے ایک دن بات ہوئی تو کہنے لگے دوزخ کے بارے میں ہمارے مذہبی تصورات کے حوالے سے اسے "تختہ" بھی کہا جا سکتا ہے یوں اس کا عنوان "جہنم کا دسواں تختہ یا دسواں تختۂ جہنم" بھی ہو سکتا ہے میں نے عرض کیا اگر اسی تصور میں تھوڑی سی شدت اور پاتال کی بھی آمیزش کر لی جائے تو "سرکل" کے لئے "گہرائی" کے مجازی معنی لئے جا سکتے ہیں کیونکہ آتش دوزخ کی شدت کا جو تاثر "گہرائی" سے ابھرتا ہے وہ شائد باقی کسی لفظ سے اتنا واضح نہیں ہو رہا۔ میرے نزدیک چونکہ ترجمے کا معیار لفظی معانی کے ساتھ ساتھ اس سے متعلقہ احساسات کی ترجمانی بھی ہے اس لئے میں نے عنوان کے علاوہ بھی کہیں کہیں اپنے اس حق کو استعمال کیا ہے۔

ایک اور مسئلہ بوسنیائی ناموں اور مقامات کے اردو ہجوں کا تھا کہ صوتی اور بصری اعتبار سے یہ اردو پڑھنے والوں کے چشم و گوش کے لئے خاصے "اجنبی اور مانوس" ہیں میں نے ظفر صاحب کی وساطت سے بوسنیا کے سفارت خانے سے رہنمائی حاصل کی ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں قارئین کو شائد معمولی سی الجھن ہو!

جہاں تک اس کتاب کے مواد کا تعلق ہے اس کی بہت حد تک وضاحت ایس ایم ظفر صاحب نے اپنے پیش لفظ میں کر دی ہے' مذہب' ثقافت اور نسل کے نام پر انسانی تاریخ نے بڑے بڑے المناک اور روح فرسا منظر دیکھے ہیں مگر بیسویں صدی کے آخری عشرے میں رونما ہونے والی یہ صورت حال کچھ ایسی ہے کہ جسے دیکھ کر انسانی ترقی اور اس کے ذہنی ارتقاء کے سارے دعوے جھوٹ اور باطل دکھائی دینے لگتے ہیں۔ صدیوں کے مراسم' ہمسائیگی' بھائی چارہ' اخوت اور محبت۔ سب کے سب کیسے تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے؟ انسان نے انسان پر وہ ظلم کیسے روا رکھا جو وحشی درندوں کو بھی شرما دے! اس کتاب کی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنوں کے ہاتھوں اپنوں کی تباہی کے اس کھیل میں 95% مرنے والوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مسلمان تھے اگرچہ صدیوں کی مشترکہ معاشرت کے باعث ان میں اور ان کے دیگر ہم وطنوں میں کوئی واضح فرق باقی نہیں رہ گیا تھا مگر اس کے باوجود انہیں صرف اور صرف "مسلمان کہلانے" کی سزا دی گئی اور ساری دنیا بشمول اسلامی دنیا کے اس قتل عام کو کم و بیش ایک تماشائی کی طرح دیکھتی رہی۔ بے گناہوں کو ان کے جرم ضعیفی کی آڑ میں کیسی کیسی اذیتیں دی گئیں اور چشم عالم اسے ایک کھیل کی طرح دیکھتی رہی۔

تاریخ کی گلیوں میں مسلم کا لہو ارزاں
اتنا نہ ہوا ہو گا!
دشوار سہی لیکن بے برگ و شجر رستہ
اتنا نہ ہوا ہو گا!
اے اشک سرمژگاں' آنکھوں سے کنارا کر
آئینہ نما ہو جا
اے شمع شب تیرہ' وہ صبح دوبارہ کر
اک حرف دعا ہو جا۔
دھندلایا ہوا چہرہ' اس ملت بیضا کا
اتنا نہ ہوا ہو گا!
تاریخ کی گلیوں میں مسلم کا لہو ارزاں
اتنا نہ ہوا ہو گا!

سو اب جہنم کی یہ دسویں گہرائی آپ کے سامنے ہے۔ بوسنین زبان سے انگریزی ترجمے میں اگر کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو مجبوری ہے کہ میری رسائی بہرحال انگریزی ترجمے تک ہی تھی البتہ جہاں تک اردو ترجمے کا تعلق ہے میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ لفظی ترجمہ کے بجائے اصل مصنف کی ذہنی سطح کے قریب تر رہوں' سو اس کے لئے مجھے کردار' موضوع' زبان اور کچھ اور اندرونی شہادتوں کے باوجود کئی مقامات پر قیاس سے کام لینا پڑا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ قارئین بھی ظن و تخمین کی اس کارروائی میں خود کو میری تفہیم سے قریب تر پائیں گے۔

یہ کتاب میں حکیم محمد سعید مرحوم کے نام معنون کر رہا ہوں کہ میرے

خیال میں یہ انہی کا حق بنتا ہے لیکن میں یہاں ایس ایم ظفر صاحب کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے اس مشکل کام میں نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ اپنی محبت بھری مسکراہٹوں اور قیمتی مشوروں سے اس کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے میں بھی میری مدد کی۔

خدا کرے کہ بوسنیا کے مسلمان اس عذاب سے جلد از جلد مکمل نجات پائیں اور آئندہ کسی مسلمان ملک یا آبادی کو اس طرح کے عذاب سے نہ گذرنا پڑے۔ آمین

امجد اسلام امجد

پہلا باب

وہ ہفتہ 30 مئی 1992ء کا ایک دھوپ بھرا خوشگوار دن تھا' جیمو کی آنکھ ساڑھے نو بجے کھلی۔ دراصل وہ باہر چلنے والی گولیوں کی تڑاتڑ کے شور سے جاگا تھا۔ گذشتہ کچھ دنوں سے جب سے پر یجیڈور میں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس نے حفاظت کے خیال سے اپنے گھر میں سونا چھوڑ رکھا تھا' اس کے گھر کا ایک دروازہ بڑے بازار کی طرف تھا جبکہ دوسری طرف' جو دھوپ کے مخالف رخ پر تھی' ببول کے گھنے جھنڈ کی طرف کھلتی تھی جو شہر کے وسط میں ہونے کے باوجود ایک گھنے جنگل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

ابھی گذشتہ رات ہی جھنڈ کے اس پار پیکانی کے علاقے سے فائرنگ کی آوازیں آئی تھیں جن کی شدت اور تعداد معمول سے کچھ زیادہ تھی جس کی وجہ سے جیمو کو بہت رات گئے سونا نصیب ہوا' نئے سال کی پہلی رات کی فائرنگ ابھی تک اس کے حافظے میں تازہ تھی جب کہ صبح کے تڑکے تک پیکانی کے علاقے سے ہر طرح کے ہتھیاروں کے چلنے کی آوازیں آتی رہی تھیں یوں لگتا تھا جیسے وہاں لگاتار زیادہ سے زیادہ راؤنڈ فائر کرنے کا کوئی مقابلہ ہو رہا تھا۔ آتشیں گولیوں کے شعلے پر یجیڈور کے آسمان کو جیسے چیرتے چلے جا رہے تھے۔ اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں لگتا تھا۔

ایک صبح جیمو نے اپنی خواب گاہ کی کھڑکی میں ایک گولی کا سوراخ دیکھا۔ یہ کھڑکی ببول کے جھنڈ کی طرف کھلتی تھی' یہ گولی گھر کے بیرونی

دروازے کے کواڑوں کو چیرتی اور کھڑکی کے دوہرے شیشوں والے چوکھٹے سے ہوتی ہوئی اس کے بستر سے کچھ ہی اوپر ایک ایسی جگہ پیوست ہوئی تھی جہاں سے بڑے آئینے کا فاصلہ محض چند انچ تھا جیمو کو یقین تھا کہ یہ فائر دانستہ طور پر اس کا نشانہ لے کر نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا' سیاست سے بھی وہ دور ہی رہا تھا اور خصوصاً" اپنے ارد گرد ہونے والی سیاست سے کہ وہ سربوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی متحارب کارروائیوں کو انتہائی مضحکہ خیز سمجھتا تھا۔ (کروٹ کروشیئن نسل کے لوگ اس علاقے میں بہت کم پائے جاتے تھے)۔

اب سے پہلے مقامی لوگ' دریائے سنا کے کنارے گرمیوں کے دنوں میں صرف فٹ بال کا میچ کھیلنے کے دوران ہی مسلمان اور سرب کے حوالے سے منقسم ہوا کرتے تھے۔ ان میچوں کا اہتمام ہمیشہ مقامی تفریحی پروگراموں کا میزبان ایکو کیا کرتا تھا جس کا کام پریجیڈور کے شراب خانوں میں ہنسنا' گانا اور بلا گلا کرنا تھا' کبھی مسلمان جیت جاتے اور کبھی سرب' لیکن مقابلے کا اختتام ہمیشہ ایک بیئر اور باربی کیو پارٹی پر ہوتا تھا جس کا اہتمام بڑی نفاست اور مہارت سے ایکو خود کیا کرتا تھا جبکہ کھانے پینے کا سارا خرچہ ہارنے والی ٹیم کے ذمے ہوتا تھا' مے نوشی کے دوران سب مل کر ناچتے گاتے اور خوب محظوظ ہوتے۔

لیکن وہ اور زمانے تھے' راتوں رات سربوں نے پریجیڈور کا کنٹرول سنبھال لیا تھا اور اب اپنے مخصوص جارحانہ انداز میں مختلف کارروائیاں کر رہے تھے' وہ فوجی وردیاں پہنتے تھے اور انہوں نے شہر کی طرف آنے والی تمام سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی تھی وہ اپنے اس عمل کو "لکڑی کی رکاوٹوں والے انقلاب" کا نام دیتے تھے' ایک صبح سرب جھنڈے شہر کی تمام اہم عمارتوں' ٹاؤن ہال' پولیس اسٹیشن اور پریجیڈور ہوٹل وغیرہ پر نصب کر دیئے گئے اپنی

پوری طویل اور بھرپور تاریخ میں پرو یبیڈور شہر بھی ایسے عجیب و غریب قبضے اور حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔

شہری' شدید پریشانی کے باعث گنگ تھے' ایسے میں کسی نے تڑاتڑ گولیاں چلا کر خاموشی میں دراڑ ڈال دی۔ پرو یبیڈور پر اس قبضے کو اب ایک مہینہ ہو چلا تھا' تمام مسلمان' شہر میں بسنے والے چند کروٹ لوگوں سمیت ملازمتوں سے برطرف کر دیئے گئے تھے' سکول بند تھے' سربوں نے ٹی وی اور ریڈیو کی تنصیبات پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے بنائے ہوئے پروگرام نشر کرنے شروع کر دیئے تھے' تمام غیر سرب اخبارات یا تو اپنی اشاعت معطل کر چکے تھے یا شہر میں ان کی فراہمی مسدود کر دی گئی تھی گویا ابلاغ عامہ کے ذرائع پر ایک مکمل پہرا لگ چکا تھا۔

"اقتدار کی جنگ"

جیمو نے سوچا' میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ معاملات اسی طرح رہیں۔

اب تک تقدیر اس پر معقول حد تک مہربان رہی تھی' اچھی تنخواہ' دو بیٹے ایک سولہ برس کا اور دوسرا بارہویں میں قدم رکھتا ہوا۔ اس کی ازدواجی زندگی کوئی بہت زیادہ قابل رشک نہیں تھی ..... دراصل جیمو نے اپنی عمر کی شمع کو دونوں کناروں سے جلانے میں کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی تھی اور اب اس بڑھتی ہوئی عمر اور جوان ہوتے ہوئے بچوں کے باوجود اس کا وطیرہ نہیں بدلا تھا۔ اس کی شامیں شراب خانوں میں جام بدست اور اپنے سے کم عمر لوگوں کی صحبت میں بسر ہوتی تھیں جن میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ اس کی بیوی ایلما کے لئے یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی مگر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتی تھی کہ وہ اس کی نہ سہی بچوں کی وجہ سے جلد

سنبھل جائے گا۔

گذشتہ ہفتے کے دن سے وہ گھر پر ہی تھا' اس دن سرب فوج نے پریجیڈور سے تقریباً" دس میل کی فاصلے پر واقع گاؤں ہیم برائن پر حملہ کیا تھا۔ اس نے یہ سارا وقت ٹی وی پر فلمیں دیکھ کر یا ہمسایوں اور گھر والوں کے ساتھ تاش کھیلتے ہوئے گذارا تھا۔

ہمسایوں اور رشتہ داروں میں اتنا زیادہ آنا جانا پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا' اس نے سوچا۔

اس رات وہ دیر تک اپنے کزن فاضل کے ساتھ تاش کھیلتا رہا تھا اور پھر اپنے گھر والوں سمیت وہیں سو گیا تھا۔

فاضل کا گھر اس کے گھر کے عین سامنے گلی کے دوسری طرف واقع تھا چنانچہ وہاں سے وہ اپنے گھر کے آس پاس ہونے والی کسی بھی غیر معمولی کارروائی کو بخوبی دیکھ سکتا تھا اور اس دن صبح ایسا ہی ہوا تھا۔

اس کے کزن فاضل نے ان کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دے کر انہیں تازہ خبر سے آگاہ کیا۔

"مقامی ریڈیو سے اعلان ہوا ہے کہ پریجیڈور پر "مسلمان انتہا پسندوں" نے حملہ کر دیا ہے"۔ یہ خبر بار بار دہرائی جا رہی تھی اور تقریباً" ہر دس منٹ کے بعد یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ

"شہریوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ حفاظت کے مدنظر وہ اپنے گھروں اور رہائش گاہوں کے اندر رہیں"۔

یہ بہار کی ایک روشن اور چمکیلی صبح تھی' فضا میں تناؤ تھا اور ایک ان دیکھے خوف کا سایا سا شہر کے بام و در میں گردش کر رہا تھا۔

ذرائع ابلاغ کی اس مستقل اور مسلسل دماغ شوئی سے صورت حال

مزید بگڑتی جا رہی تھی' ایسے حالات میں عام طور پر کسی ایسی حرکت کو ظہور پذیر ہونے میں دیر نہیں لگتی جس کے نتائج ناقابل تصور حد تک خوفناک ہوتے ہیں۔

لوگ اب بھی ایک دوسرے کو تسلیاں دے رہے تھے کہ صورت حال زیادہ نہیں بگڑے گی مگر انہیں خود اپنے لفظوں پر اعتماد نہیں تھا' انہیں بخوبی علم تھا کہ کچھ فاصلے پر سراجیوو میں ایک باقاعدہ جنگ لڑی جا رہی ہے مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے یہی کہتے تھے۔

"لڑائی کا علاقہ ہم سے بہت فاصلے پر ہے" یہاں کچھ نہیں ہو گا' یہ کوزارا کی پہاڑیاں ہیں' یہاں صدیوں سے سب لوگ مل جل کر رہ رہے ہیں!"۔

لیکن ان کے دیکھتے دیکھتے شہر کی گلیاں ایسے اجنبی چہروں سے بھر گئیں جو سرتاپا ہتھیار بند تھے' ان کی وردیوں پر طرح طرح کے نشانات ثبت تھے' یہ سب کے سب سرب تھے جن کا ایک ایک فرد' حتیٰ کہ بچے تک مسلح تھے۔ مخصوص انداز کی فوجی وردیاں' ایک خودکار رائفل' دونوں بازوؤں پر گولیاں محفوظ رکھنے والی کم از کم دو' دو پیٹیاں' چمڑے کے غلاف میں ایک بڑا خنجر نما چاقو' اور کچھ دستی بم۔ یہ سب کچھ ایک وفادار سرب کی شناختی علامات بن چکی تھیں' ایک مسلح سرب ہی حقیقی معنوں میں سرب کہلانے کا مستحق تھا۔

باقی کے سب سرب ان کے نزدیک ان کی اس نام نہاد سرب جمہوریہ کے مخالفین تھے جو انہوں نے آپ ہی آپ بنالی تھی' یہ جانتے ہوئے بھی کہ بوسنیا ہرزیگووینا کی بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحدوں میں ایسی کسی ریاست کا وجود ایک غیر حقیقت پسندانہ خواہش سے زیادہ کچھ نہیں' وہ اس

کے قیام پر تلے ہوئے تھے۔

نئی انتظامیہ نے آتے ہی کچھ ایسے اقدامات کئے جن کا مقصد غیر سرب آبادی کو مکمل اطاعت اور غلامی پر مجبور کرنا تھا' ان کے یہ نئے غیر فوجی رضاکار پوری شدت کے ساتھ اپنے احکامات کی تعمیل کروا رہے تھے اور یوں لوگوں کے درمیان قائم اخوت اور بھائی چارے کی صدیوں پرانی فضا لمحہ بہ لمحہ ریزہ ریزہ ہو کر ایک مضحک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ انہوں نے نفرت کے منظم پھیلاؤ کا ایک ایسا راستہ اختیار کیا تھا جس میں غیر سرب یا اس سے ملتے جلتے کسی بھی آدمی کے لئے سانس تک لینے کی گنجائش نہیں تھی' بلاتمیز اخلاقی پستی اور اذیت رسانی کا مظاہرہ ہر سرب کے لئے گویا ایک پہچان بن چکا تھا۔ دیکھنے والوں کے لئے یہ منظر انتہائی حیرت کا موجب تھا کہ کس طرح پرانے دوست اور جان پہچان والے گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر اس نئی انتظامیہ کے جنونی ہتھکنڈوں کے آلہ کار بن گئے تھے' سربوں کے اس گروہ کے لئے بوسنیا ہرزیگونیا ایک "متروک جمہوریہ" تھی اور ان کے ذرائع ابلاغ اس اصطلاح کو بار بار دوہراتے رہتے تھے۔ ان جھوٹ گھڑنے والی فیکٹریوں میں بنجالو کا اور پیل ٹی وی کے ساتھ ساتھ اخبار "بنجالو کا ڈیلی وائس" بھی شامل تھا (جس کا نام بعد میں تبدیل کر کے "سرب وائس" کر دیا گیا تھا)

جیمو کو معلوم تھا کہ اس طرح کی جنگ میں سب سے پہلے گرنے والی لاش "سچ" ہی کی ہوا کرتی ہے۔

پریجیڈور کا مقامی اخبار "کوزارا ہیرلڈ" بھی باقی میڈیا کی طرح ابھی "سرب رنگ" میں رنگا جا چکا تھا' ہر جمعے کو اخباروں کے سٹالز پر نئی افترا پردازیوں کا بازار لگتا تھا ہیرلڈ کا مدیر مائل میوٹک' جو اب اس کا مالک بھی تھا

اپنے مذہبی اور نظریاتی بھائیوں کو زوکو' ایکم اور ریڈ میوٹک کے ساتھ تین شفٹوں میں جھوٹ تخلیق کرنے میں جتا ہوا تھا اور اس سے بھی خطرناک بات یہ تھی کہ ان نام نہاد مقامی لکھاریوں نے "صحافت" کی معزز اصطلاح کو یرغمال بنا لیا تھا۔ میوٹک صرف ایک بے اصولا اور بے ایمان نامہ نگار ہی نہیں تھا بطور انسان بھی اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی وہ سابقہ یوگوسلاویہ کی فوج میں رہنے کے علاوہ اور پتہ نہیں کیا کیا کرتا رہا تھا' وہ دن رات غیر سرب آبادی کو دھمکیاں دیتا رہتا تھا کہ وہ اپنے ہتھیار' چاہے وہ قانونی ہی کیوں نہ ہوں' پھینک دیں کیونکہ سربوں کے سوا کسی اور شخص کو ہتھیار رکھنے کا حق نہیں ہے' اس کا یہ تصعب اب ایک نعرہ ٔ جنگ بن چکا تھا۔

وہ شخص (اگر اسے انسان کہا جا سکتا ہو) شاعری کا بھی دعوئی رکھتا تھا حالانکہ اسکی تحریر کو شاعری سے دور کا علاقہ بھی نہیں تھا۔ اسے دوسروں کی اذیت سے تسکین ملتی تھی' انسانوں کی توہین اور بے حرمتی اس کے لئے روحانی غذا کا درجہ رکھتے تھے۔ میوٹک دراصل ان لوگوں میں سے تھا جن کا شمار کوزارا پہاڑیوں میں واقع اس شہر کی تاریخ اور عوام کی تباہی کے بدترین نمائندوں میں ہونا چاہئے۔ اپنے لوگوں کے لئے جس نئی تاریخ کا تصور وہ پیش کرتا تھا اس کی بنیاد تمام غیر سرب لوگوں کی ہلاکت اور ان کے مکمل انخلاء پر قائم تھی۔ اس کا یہ نام نہاد "شاعرانہ تصور" ایک انتہائی مضحک حقیقت کا روپ دھار چکا تھا اور اسے پایہ ٔ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اسے مقامی انتظامیہ کی مکمل تائید حاصل تھی۔

"اخلاق اور صحافتی اقدار" اس کے لئے قطعاً" اجنبی الفاظ تھے۔

اخبار اور ریڈیو کے تعلق کے حوالے سے جیمو اور میوٹک کے تعلقات

کبھی بھی مثالی نہیں رہے تھے۔ اس نے اس کے بھاری بھرکم اور باریش وجود کو پائپ منہ میں دبائے اور ایک چمڑے کا بیگ کندھے پر لٹکائے کئی بار آتے جاتے دیکھا تھا۔ آج صبح جیمو نے اس کی بھاری اور کھردری آواز ریڈیو پر پہچان لی وہ بار بار اپنے سامعین کو بتا رہا تھا کہ پریجیڈور پر مسلم انتہا پسندوں کا حملہ ہو گیا ہے، اس نے شہریوں کو تنبیہہ کی کہ وہ اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں اور ہنگامی کمیٹی کی طرف سے انہیں یقین دلایا کہ ایسا کرنے کی صورت میں ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی جائے گی۔ اس نے مزید کہا کہ تمام وفادار شہری اپنے گھروں پر سفید جھنڈے نمایاں کر کے لگائیں۔ بچے تک جانتے تھے کہ سفید جھنڈوں کا یہ چکر دراصل غیر سربوں کے گھروں کی نشاندہی کے لئے ہے!

جیمو نے اپنی معمول کی صبح کی کافی پی اور ایک سگرٹ سلگا کر چند کش لئے، اس دوران میں وہ وقفے وقفے سے کھڑکی سے اپنے گھر کی طرف بھی دیکھتا رہا، اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ ایک دوسری کھڑکی سے اس نے اپنے گھر سے چالیس گز کے فاصلے پر واقع اگلی عمارت کی طرف دیکھا تو اسے عمارت کی چھت پر دو مسلح فوجی نظر آئے جو وقفے وقفے سے ایک نزدیکی رہائشی علاقے سکیلا کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔

"ان لوگوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا" جیمو نے کھڑکی کے قریب سے اس میز کو ہٹاتے ہوئے سوچا جس پر وہ کچھ دیر قبل بیٹھے تھے ایلما اپنے گھر ناشتہ تیار کرنے کے لئے گئی ہوئی تھی، اس نے آتے ہی ناشتہ میز پر لگانا شروع کر دیا فاضل کی بیوی کچھ دیر چولہے کے ساتھ مصروف رہی اور پھر وہ سب ناشتے کے لئے بیٹھ گئے، شہر ابھی تک خودکار ہتھیاروں کی فائرنگ کے شور سے

گونج رہا تھا۔

یکدم فاضل کی نظر جیمو کے گھر پر پڑی اس نے کہا

"تمہارے گھر کے نزدیک کچھ فوجی پھر رہے ہیں"۔

جیمو نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا تو دیکھا کہ دو مسلح نقاب پوش بڑے محتاط انداز میں اس کی بلڈنگ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہے ہیں' انگلیاں اپنی رائفلوں کے ٹریگرز پر رکھے وہ قدرے جھک کر چل رہے تھے' عین اسی لمحے فاضل کے دروازے پر ایک زور دار دستک کی آواز سنائی دی' دروازہ کھلا اور جیمو نے دیکھا کہ سامنے والے دو فوجیوں جیسا ہی ایک نقاب پوش فوجی دروازے میں کھڑا تھا اور اس نے اپنی رائفل ان پر تان رکھی تھی۔

"کیا تمہارے گھر میں کوئی ہتھیار ہے" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

چند لمحوں کے لئے فاضل اور جیمو ہکا بکا سے ہو گئے۔

"کیا تم بہرے ہو" وہ چلایا' "میں نے پوچھا ہے تمہارے پاس ہتھیار ہیں یا نہیں؟"

"نہیں بھائی" ...... فاضل نے کہا' "ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے"۔

"نہ میں تمہارا بھائی ہوں اور نہ کبھی ہو سکتا ہوں' یہ بات اچھی طرح پلے سے باندھ لو اور ہاں تم کیا کہتے ہو' اس نے جیمو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ...... کبھی تھا ہی نہیں"۔ جیمو نے کہا۔

فوجی مکمل بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتا ہوا کمرے کے اندر آ گیا' اس نے ایک لمحے کے لئے بھی رائفل جھکائے بغیر' چاروں طرف کا جائزہ لیا

اور میز پر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو اپنے نشانے کی زد پر لیتا ہوا بولا۔

"تمہیں یہاں سے نکلنا ہو گا" اس نے جیسے انہیں حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"چاروں طرف فائرنگ ہو رہی ہے۔ اس کے بند ہونے تک ہم تمہیں کسی محفوظ مقام پر رکھیں گے"۔

اس نے خطرناک انداز میں اپنی رائفل جیمو اور فاضل کی طرف لہراتے ہوئے انہیں باہر نکلنے کے لئے کہا۔

پہلے فاضل اٹھا اور بازو سر سے اوپر اٹھائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ فوجی اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف رکھتے ہوئے فاضل کے پیچھے جانے کے لئے مڑا۔ بچے دہشت سے چیخ رہے تھے۔

اس کے بعد جیمو' ہاتھ سر کے پیچھے کئے آہستگی کے ساتھ اٹھا اور تقریباً" سلو موشن کے انداز میں دروازے کی طرف چلا' اسے پتہ تھا کہ ایسی صورت حال میں ذرا سی تیز اور غیر محتاط حرکت کتنی نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

جب وہ فوجی کے قریب سے گذر رہا تھا اس نے دزدیدہ نظر سے نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کی' مگر وہ کوئی اجنبی چہرہ تھا۔

"گھبراؤ نہیں جیمو' تمہیں کچھ نہیں ہو گا" سپاہی نے کہا۔

جیمو نے محسوس کیا کہ جیسے اس نے یقین دہانی کے انداز میں اس کے کندھے کو بھی ہلکے سے دبایا ہو۔

جیمو نے دوبارہ غور سے دیکھا مگر سیاہ نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے کو نہ پہچان سکا' فوجی کی آواز بھی مانوس نہیں تھی۔ وہ چند قدم چل کر گھر کے صحن میں آ گیا جہاں ایک اور فوجی زیادہ گہرے رنگ والی وردی میں' پہلے سے

موجود تھا۔

اس نے جیمو اور فاضل کو عمارت کے داخلی دروازے کی طرف چلنے کو کہا جو ببول کے جھنڈ کی طرف واقع تھا تقریباً" ایک سو گز کا یہ فاصلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا' فاضل' جیمو سے آگے چل رہا تھا جیمو نے بندوق کی بھاری نال کا وزن اپنی کمر پر ایسے محسوس کیا جیسے وہ اس بھاری بوجھ کو خود اٹھا کر چل رہا ہو۔ ہوا میں بارود اور چیزوں کے جلنے کی بو رچی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے پر وہ دھوئیں کے سیاہ بادل کو فضا میں پھیلتے دیکھ رہا تھا' پرانا شہر آگ میں جل رہا تھا جیمو مڑ کر' صرف ایک نظر' اپنے گھر کی طرف دیکھنا چاہتا تھا کہ اپنے اہل خانہ کی حالت دیکھ سکے مگر اسے حوصلہ نہیں ہوا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ نظراس کے لئے نگاہ آخریں نہ بن جائے۔

جب وہ عمارت کے دروازے پر پہنچے تو ان کے عقب میں آنے والا فوجی وہیں رہ گیا اور دروازے کے نزدیک کھڑے ایک اور فوجی نے انہیں عمارت کے اندر داخل ہونے کے لئے کہا' وہ گرتے پڑتے تہہ خانے میں اترے جہاں انہیں کئی اور ہمسائے نظر آئے جو سب کے سب مسلمان تھے' دروازے کے قریب ان کے کچھ سرب ہمسائے کندھوں پر رائفلیں لٹکائے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

پیرو' جو اسی بلڈنگ میں رہتا تھا اور سب کو جانتا تھا' بولا۔

"یہ تہہ خانہ تمہارے لئے محفوظ جگہ ہے' گھبراؤ نہیں ہم تمہیں یہاں صرف اس وقت تک رکھیں گے جب تک یہ ہنگامہ فرو نہیں ہو جاتا"۔

اس کے بعد اس نے ان سب کو گھر کی تیار کی ہوئی آلو بخارے کی برانڈی بھی پیش کی۔

وہ سب پیرو کو ایک اچھا اور بااعتماد ہمسایہ سمجھتے تھے' اگرچہ یہ حسن ظن ایک طرح سے ان کی مجبوری بھی تھی۔ برانڈی کی بوتل دست بدست سب تک پہنچی اور چند ہی لمحوں میں خالی ہو گئی لیکن اس سے ان کے منتشر حواس کچھ دیر کے لئے پرسکون ضرور ہو گئے۔ جہنم کا راستہ ہمیشہ بہت نیک نیتی سے تیار کیا جاتا ہے' جیمو نے ایک سگرٹ سلگاتے ہوئے اپنے دل میں سوچا' اس نے سب کو سگرٹ پیش کیا اور سیڑھیوں کے نیچے سے ایک مضبوط گتے کا ٹکڑا لے کر اس پر بیٹھ گیا۔

"جب تک یہ سارا ہنگامہ فرد نہیں ہو جاتا" پیرو کے یہ الفاظ جیمو کے دماغ میں بار بار گونج رہے تھے' لیکن یہ کب ختم ہو گا؟

دس منٹ بعد' فوجی تین اور ہمسایوں کو لے آئے' یہ بھی مسلمان تھے' ان کے بعد دو اور آئے اور پھر ان کے بعد اس کا کزن نودو اور اس کا بیٹا علی جان اور ان کے ساتھ جیمو کا اپنا بیٹا ایری جو سولہ برس کی عمر میں' بڑا بڑا سا لگ رہا تھا' زندگی نے ابھی اس پر خود کو آشکار کرنا شروع ہی کیا تھا ..... ایری زار و قطار رو رہا تھا۔

"مت رو میرے بچے' انشاء اللہ یہ سب کچھ بہت جلد ختم ہو جائے گا' روتے نہیں' جوان آدمی کے لئے رونا شرم کی بات ہے' اب تم بڑے ہو چکے ہو' شاباش ...." جیمو نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے برداشت نہیں ہوتا......" ایری نے سسکی بھرتے ہوئے کہا' انہوں نے اسے مار دیا ہے ......!

جیمو کو خون اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا' سب سے پہلے اس کا دھیان اپنے چھوٹے بیٹے دینی اور پھر بیوی کی طرف گیا' اس کا رنگ اڑ گیا'

ایک لمحے کے لئے اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر اپنے گھر پہنچ جائے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

کیسے؟ کسے مار دیا ہے انہوں نے! اس نے بمشکل پوچھا۔

ایری نے اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا اور پھر اس سے لپٹ کر روتے ہوئے بولا۔

"انہوں نے لینڈو کو مار دیا ہے؟ گولیوں کا ایک پورا راؤنڈ اس کے جسم میں اتار دیا ہے"۔

جیمو نے ایک اور سگرٹ سلگایا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں لوگوں کے اوپر کی طرف چھوڑا۔

"خوف بھی آدمی کو کیسے کیسے وہموں میں مبتلا کر دیتا ہے" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ لینڈو' جیمو خاندان کا صحیح معنوں میں محبوب خاص تھا' سیاہ رنگ کا ڈابرمین ایک حسین اور شاندار کتا' جو ابھی صرف اٹھارہ ماہ کا تھا' ایری اس کو اکثر اپنے ساتھ سیر کرانے یا باغ میں کھلانے کے لئے لے جاتا تھا جس کا ایک مقصد اپنے دوستوں پر رعب ڈالنا بھی تھا۔ اس نے اسے مختلف طرح کے کرتب سکھا رکھے تھے جیسے پھینکی ہوئی لکڑی یا گیند کو واپس لانا' یا اس کے ساتھ تیرنے کے لئے پانی میں چھلانگ لگانا' کتے نے نہر کے اوپر واقع ایک بہت تنگ سے پل پر چلنا بھی سیکھ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ایری کے اشارے پر وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر اگلے پاؤں ایری کے سینے پر رکھ کر اس کا چہرہ بھی چاٹا کرتا تھا۔

جیمو کو اس کتے سے بہت پیار تھا اور اسے اس کی موت کا بہت غم بھی تھا' اس نے اپنے روتے ہوئے بیٹے کو تسلی دینے کے لئے اس سے بالکل لینڈو

جیسا ایک اور کتا لا دینے کا وعدہ کیا لیکن کوئی ان دیکھی قوت اسے یہ احساس دلا رہی تھی کہ شاید اسے اپنا یہ وعدہ نبھانے میں بہت دن لگ جائیں گے۔

سیڑھیوں کے نیچے تقریباً" بیس لوگ جمع ہو چکے تھے' یہ کہنا غالباً" زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ جمع ہوئے نہیں تھے بلکہ کئے گئے تھے۔ پیرو نے ان سب کی ایک فہرست تیار کی اور ان سے کہا کہ وہ اپنے پاس موجود رقم اور دیگر قیمتی چیزیں حفاظت کے لئے اس کے حوالے کر دیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ یہ ہنگامہ فرو ہونے پر ساری امانتیں حقداروں کو لوٹا دے گا" ہمسایوں نے ایسا ہی کیا کیونکہ وہ اس پر اعتماد کرتے تھے۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد پیرو نے جیمو کو باہر آنے کے لئے کہا کیونکہ باٹو کووا کوک نامی ایک پولیس والے نے' جسے جیمو اچھی طرح جانتا تھا اسے طلب کیا تھا' باہر آتے ہی جیمو نے اپنے آپ کو ایک آٹومیٹک رائفل کی اٹھی ہوئی نال کے روبرو پایا' باٹو نے اسے اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھانے کا حکم دیا اور پھر اسے دھکیلتا ہوا بلڈنگ کے دوسرے کنارے پر کھڑی ایک عام سی ویگن کے پاس لے گیا۔ راستے میں جیمو نے دیکھا کہ عمارت کے ہر دروازے پر طرح طرح کے ہتھیاروں سے مسلح سرب ہمسائے نگرانی پر کھڑے تھے' باٹو نے اس کو ایک بورے کی طرح ویگن کے عقبی حصے میں پھینکا اور باہر سے تالا لگادیا۔ امری' ریڈرو' موجو اور جیمو کے کئی اور ہمسائے پہلے سے وہاں موجود تھے' ویگن میں کوئی کھڑکی نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکتا کہ انہیں کس طرف لے جایا جا رہا ہے۔

چند منٹ چلنے کے بعد ویگن یکدم رک گئی' عقبی دروازہ کھلا وہ باہر نکلے تو دیکھا کہ وہ تھانے کے قریب کھڑے ہیں' ان کے گرد بہت سے مسلح اور

کچھ نقاب پوش فوجی اپنے وردی نما لباس پہنے کھڑے تھے۔ مٹی کے تیل کے جلنے کی بو سارے میں پھیل رہی تھی' اس کے ساتھ ہی انہوں نے جنریٹر کے چلنے کا مخصوص شور سنا' انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے ہاتھ اٹھا کر اور ٹانگیں چوڑی کر کے' دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔ پھر ایک پولیس والا آگے بڑھا اور مسلسل مغلظات بکتے ہوئے ان کی ایسے تلاشی لینے لگا جیسے فلموں میں عادی اور پرانے مجرموں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ جیمو کی ایک جیب میں سگریٹ کی ڈبی اور لائٹر اور ایک دوسری جیب میں کچھ پیسے اور اس کا شناختی کارڈ تھا' پولیس والے نے سگریٹ اور لائٹر رکھ لئے اور پیسے اور شناختی کارڈ اسے واپس کر دیا۔

تقریباً" آدھے گھنٹے تک انہیں اسی روبہ دیوار حالت میں رکھا گیا' اس دوران میں ان پر مسلسل گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ گاہے گاہے کوئی رائفل کی ضرب بھی ان میں شامل ہو جاتی تھی۔ دھوپ کی تیزی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ ایک وقت تو ایسا آیا جب جیمو نے محسوس کیا کہ اب معاملہ اس کی سہار سے باہر ہو گیا ہے اور وہ عنقریب گر جائے گا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ چیزیں اس کے سامنے جیسے جل بجھ رہی تھیں' یکدم اس کا ایک گھٹنا مڑا اور وہ چکرا کر زمین پر گر گیا' ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر بغل میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا اور اس کے ہاتھ میں ایک بیئر کا ڈبہ دیتے ہوئے کہا۔

"اسے پی لو طبیعت سنبھل جائے گی" جیمو نے جلدی سے دو ایک بڑے بڑے گھونٹ لئے اور سچ مچ اس کے اوسان بحال ہو گئے' اس نے بیئر کا ڈبہ دیوار کی نگر پر رکھ کر سپاہی کی طرف دیکھے بغیر اس کا شکریہ ادا کیا۔ خواہش کے باوجود اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ مڑ کر اپنے محسن کی شکل دیکھ

سکتا۔

اس کے بعد سپاہی انہیں دو دو کر کے اوپر لے گئے' جہاں سے باقی رہ جانے والے' ان کی چیخوں' سپاہیوں کی گالیوں اور مار پیٹ کی دہشت ناک آوازیں واضح طور پر سن سکتے تھے کچھ ہی دیر بعد جیمو اور اس کے ایک ساتھی باری آ گئی' آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ایک دبلا پتلا اور بڑی سی داڑھی والا نوجوان ان کے روبرو ہوا جس سے تقریباً" ایک گز کے فاصلے پر بھاری ہتھیاروں سے مسلح بہت سے سپاہی کھڑے تھے' سب کے ہاتھوں میں لکڑی' ربڑ یا پلاسٹک کے بنے ہوئے ڈنڈے تھے مگر کسی نے انہیں جیمو پر استعمال نہیں کیا۔

جب جیمو اور اس کا ساتھی کنٹین کی طرف جانے والے دروازے کے نزدیک پہنچے تو ایک سپاہی نے جیمو کو وہیں رکنے کے لئے کہا اور اس کے ساتھی کو اپنے ساتھ اندر لے گیا' دروازہ نیم وا تھا جہاں سے جیمو کو ہر چیز بخوبی دکھائی دے رہی تھی' انہوں نے جیمو کے ساتھی پر مکوں ڈنڈوں' ٹھڈوں اور ہر اس چیزوں کی بارش کر دی جو ان کے ہاتھ لگ سکتی تھی وہ اسے طرح طرح کی غلیظ گالیاں دیتے ہوئے مسلسل زدوکوب کر رہے تھے۔

"ہم تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی حفاظت کر رہے ہیں اور تم ہم پر گولیاں چلاتے ہو؟ تم نے اپنے گھر کی چھت پر فائرنگ کے لئے مورچہ بنا رکھا ہے"۔

اس طرح کی الزام تراشیاں کرتے ہوئے ان کے تشدد کی رفتار اور تیز ہو جاتی تھی۔

مضروب شخص نے ہر طرح کی قسمیں کھا کر انہیں یقین دلانے کی

کوشش کی کہ وہ بے قصور ہے نہ اس کے اور نہ ہی اس کے خاندان کے کسی اور فرد کے پاس کسی قسم کا کوئی ہتھیار ہے لیکن کسی نے اس کی صفائی اور التجاؤں پر کان نہ دھرا اور اسے مسلسل مار پڑتی رہی' اس کی داہنی آنکھ سے خون ایک لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا آخرکار سپاہیوں نے اسے ادھ موا کر کے اس کمرے میں دھکیل دیا جہاں جیمو پریشان اور ششدر کھڑا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب کھڑے ہوئے باوردی آدمیوں نے اس بدنصیب زخمی کو پکڑا اور مزید مارتے پیٹتے اور دھکے دیتے ہوئے اسے سیڑھیوں سے نیچے لے گئے۔ اب جیمو کی باری تھی۔

ایک سپاہی نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا' وہ دو تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو ان غضب ناک درندوں کے درمیان پایا جن کے چہروں پر وحشت برس رہی تھی' وہ ذہنی طور پر متوقع مار پیٹ کے لئے تیار تھا مگر اس کی حیرت کی حد نہ رہی جب اس سے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا گیا۔

"دیکھو ہمیں حملے کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو تم اس وقت کہاں تھے؟"

جیمو سوچ میں پڑ گیا کہ اس سوال کا کیا جواب دے؟

اگر وہ یہ کہے کہ اسے کسی بات کا علم نہیں اور اس نے حملے کے بارے میں صرف ریڈیو سے نشر ہونے والی خبریں ہی سنی ہیں تو وہ لوگ اس کا اعتبار نہیں کریں گے۔ اسے احساس تھا کہ اس کے پاس سوچنے کے لئے زیادہ وقت نہیں چنانچہ اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

جب سے ہیمبرین میں فائرنگ ہوئی ہے' میں نے سارا وقت اپنے گھر

میں' اپنی فیملی کے ساتھ گذارا ہے' یہاں پکڑ کر لائے جانے سے پہلے میں نے ہنگامی کمیٹی کی طرف سے ریڈیو پر نشر ہونے والی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا ہے۔

اس نے یہ ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں اور پھر اپنا سر کندھوں کی طرف جھکائے ہوئے ان کے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا جسم ایک ایسے انوکھے خوف سے کپکپا رہا تھا جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

"یہ سچ کہہ رہا ہے" میں اسے جانتا ہوں یہ ریڈیو پر کام کرتا ہے" اس کے پیچھے سے کسی کی آواز آئی اور پھر اس زندگی بخش آواز کا مالک اس کے سامنے آیا' وہ ایک اجنبی چہرہ تھا لیکن اس کی وردی پر چسپاں نشانات اور کندھوں پر لگے ہوئے امتیازی تمغے اس بات کے شاہد تھے کہ وہ اس وقت وہاں کا افسر مجاز تھا۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ تمہارے ہمسایوں میں سے کس کس کے پاس ہتھیار موجود ہیں؟ اس نے پوچھا۔

"یقین کرو میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا" جیمو نے براہ راست اس تمغوں والے کو جواب دیا۔

"میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کہ میرے کس ہمسائے کے پاس کیا ہے اور وہ کیا کرتا ہے' بلکہ میں تو ان میں سے اکثر سے متعارف بھی نہیں ہوں" اس کو پورا احساس تھا کہ اس کا یہ بیان اس کی متوقع پریشانیوں کو کم نہیں کر سکے گا۔ "اسے لے جاؤ" کمانڈر نے کھڑکی کے قریب میز کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے ایک حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

باہر کھڑے مشٹنڈوں کے ہاتھوں میں اگرچہ ڈنڈے موجود تھے لیکن انہوں نے بھی جیمو پر ہاتھ نہیں اٹھایا' یوں لگتا تھا جیسے کسی خفیہ اشارے کے ذریعے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہو۔

اس وقت جیمو کو قطعاً" اندازہ نہیں تھا کہ وہ جہنم کے پہلے منطقے میں داخل ہو چکا ہے۔

دوسرا باب

اسی سہ پہر کے اختتام پر تمام قیدیوں کو ایک بس میں لاد دیا گیا' جس کے ایک طرف کے پیچھے دیکھنے والے شیشے کے ساتھ بندھا ایک بڑا سرب جھنڈا لہرا رہا تھا' تین سپاہی اگلی سیٹ پر قیدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے' بس روانہ ہوئی اور انڈر پاس سے ہوتی ہوئی پہلے دائیں اور پھر بائیں طرف مڑ کر کاغذ کے کارخانے کی طرف چلنے لگی۔ جہاں سے وہ اس سڑک کی طرف مڑ گئی جو دریائے سینا کے کنارے کے متوازی چل رہی تھی' جیمو نے پرانے شہر کی طرف دیکھا جلتی ہوئی چھتوں پر شعلوں کی زبانیں لہرا رہی تھیں' گھرے دھوئیں کے بگولے سیاہ اور دیوہیکل بادلوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ پرانا شہر جو سینا اور بریک کے درمیان ایک جزیرے کی طرح گھرا ہوا تھا اس وقت ایک بہت روشن مشعل کی طرح لگ رہا تھا۔

"تم سب کے گھر بھی اس طرح جلائے جائیں گے" سپاہیوں میں سے ایک نے کہا۔

جیمو ایک بزدلی ملی خاموشی کے ساتھ اپنے دانت بھینچتا اور مایوسی کی ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا' ایک ناقابل برداشت توہین کا احساس اسے روندے ڈال رہا تھا اسے لگا کہ وہ پرانے شہر کے جلنے کا یہ منظر اپنے آخری سانس تک فراموش نہیں کر سکے گا' شہر کا وہ حصہ اس کی بہت سی حسین یادوں کا منبع اور محور تھا' یہیں دریائے بریک کے کنارے وہ پہلی بار محبت کی لذت سے آشنا ہوا تھا' یہیں اس نے اپنا پہلا سگریٹ پیا تھا' وہاں کے اوپن ایئر تھیٹر میں کئے ہوئے رقص نہ صرف پریجیڈور کے باشندوں بلکہ ان سب کے لئے ناقابل

فراموش تھے جو دوسرے علاقوں سے موسم گرما گذارنے کے لئے یہاں آیا کرتے تھے ...... اور پھر راتوں میں دریائے سینا میں تیراکی کا لطف ...... یادیں اس پر حملہ آور ہوتی چلی گئیں اور اسے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا' درد اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلا اور اس کے جسم پر بے چارگی اور ذلت کا بوجھ بڑھنے لگا اس نے سگریٹ کے لئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا مگر اسے یاد آیا کہ وہ تو تھانے میں اس سے چھین لئے گئے تھے۔

جھکے ہوئے سروں اور امید سے خالی آنکھوں والے قیدیوں کو لئے لڑکھڑاتی ہوئی بس ایک انجانی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی' سامنے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے سرب سپاہی کبھی کبھی راہگیروں کو سربوں کے مخصوص طریقے سے ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھا کر مبارکباد کے انداز میں سلام کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ عجیب ناقابل فہم قسم کے گیت بھی گا رہے تھے۔

دیہاتیوں کے ایک گروہ نے جو فوجی کپڑوں اور کیچڑ بھرے بوٹ پہنے ہوئے تھا بس کے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا انہوں نے محافظ سپاہیوں سے فرمائش کی کہ قیدیوں کو ان کے سپرد کر دیا جائے' قیدیوں کے خوف زدہ چہروں کو دیکھ کر ایک اجڈ دیہاتی نے اپنے ہاتھ کو چاقو کی طرح گردن پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ غدار کروشیائی فاشسٹ ہیں جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کا ساتھ دیا تھا' ان سب کو "شارٹ کٹ" کے ذریعے کیفرکردار تک پہنچا دینا چاہئے' اس کا چہرہ نفرت کی شدت سے مسخ ہو کر انتہائی خوفناک لگ رہا تھا وہ اور اس کے ساتھی ان قیدیوں کو بغیر کسی مقدمے اور قانونی کارروائی کے وہیں ہلاک کرنا چاہ رہے تھے حالانکہ شاید وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں

جانتے تھے۔

سپاہیوں میں سے ایک نے مبہم سے انداز میں ان سے کوئی بات کی اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ دروازہ بند کر کے چل پڑے' کھڑکی سے باہر جیمو نے کزارا پہاڑیوں کے دامن میں بچھے وسیع و عریض میدان پر نظر دوڑائی' اس نے دیکھا کہ زیر کاشت رقبے کی بلند تر سطح تک جہاں تک نگاہ جاتی تھی' زرخیز' ہل چلی ہوئی اور بیجوں بھری زمین پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

"یہ فصل کون کاٹے گا؟" جیمو سوچنے لگا۔

رکھوالوں کے بغیر' گائے بھینس' گھوڑے' بھیڑیں اور نومولود دنبے کھیتوں میں چرتے پھر رہے تھے' ان کے آس پاس جلتے اور جھلستے ہوئے مکانوں سے لپکتی ہوئی شعلوں کی زبانیں اور دھوئیں کے مینار ان کے سروں کے اوپر خاصی بلندی تک پھیلے ہوئے تھے' گھروں کے سامنے صحنوں میں دھلے ہوئے کپڑے رسیوں پر لٹک رہے تھے۔

کسی کو بھی اس ناگہانی آفت کا اندازہ نہیں تھا۔

جیمو کو عظیم ناول نگار آئیو اینڈرک کے الفاظ یاد آئے۔

"بلقان میں کسی وقت' کچھ بھی ہو سکتا ہے"۔

اس پہاڑی علاقے میں جہاں تاریخ' فوجی قدموں کی چاپ سے ہم آہنگ ہو کر چلتی تھی وہ بدترین 'ہونی' ہو چکی تھی۔

کزارا کی پہاڑیوں کے باسی ہر جنگ اور ہر آفت کے بعد نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا طویل تجربہ رکھتے تھے۔ وہ سخت جان لوگ تھے اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوم' اپنے کھیتوں' گھروں' پہاڑیوں اور ان پر تنے ہوئے آسمان کے ٹکڑے سے ان جیسی محبت

نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے پہلے ہونے والی جنگوں میں مقامی باشندوں نے بوسنیا کے اس سرحدی علاقے کو مختلف دشمنوں کے حملوں سے بچانے کے لئے داد شجاعت دی تھی مگر اب ...... کسے خبر ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہ کون عظیم جنگ جو تھے جنھوں نے اپنے کھیتوں سے منہ موڑ کر اور اپنے پیچھے بیئر کی آدھی خالی بوتلیں چھوڑ کر توپوں اور مشین گنوں سے دوستی کر لی تھی؟ وہ گولیاں اور گولے چلاتے تھے' یہ جانے اور سوچے بغیر کہ وہ کس کو نشانہ بنا رہے ہیں؟ بے تحاشا اور اندھا دھند فائرنگ ان کا محبوب ترین مشغلہ بن چکی تھی۔

یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں کہ ایک بار انہی لوگوں نے بہت سی قربانیاں دی تھیں' ایک بڑی اچھائی کے حصول کے لئے فاقے کاٹے تھے مگر اب یہی لوگ تمام قانونی تقاضوں کو توڑ کے قومی فوج کے نام پر ایک ایسے متعصب اور گروہی مفادات کے حامل لشکر کو مسلح کر رہے تھے' جو کبھی سب کی مشترکہ فوج ہوا کرتی تھی۔ یوگوسلاویہ کی عوامی فوج! پانچ کونوں والے ستارے کے نشان اور "عوامی" کے سابقے کی حامل فوج! جو اب انہی ہتھیاروں سے اپنے بوسنین ہم وطنوں پر حملے کر رہی تھی جو مشترکہ دشمن کے خلاف دفاع کے لئے حاصل کئے گئے تھے۔ اب وہ دشمن ساتھ والے گھر کے ہمسائے اور اپنے ہی محلے کے مکین کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ کل تک بوسنیا کے لوگ پیار محبت سے مل جل کر رہ رہے تھے' چائے خانوں کی محفلوں' تقریبات اور جنازوں میں ایک ساتھ شریک ہوا کرتے تھے ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے اور آپس میں رشتہ داریاں کرتے تھے لیکن اب ......!!

پرانے اور تاریخی گیت "جہاں عوامی فوج پاؤں رکھتی ہے" میں جیمو

نے اپنی طرف سے ایک لائن کا اضافہ کیا تھا "وہاں پھر کبھی گھاس نہیں اگتی" عجیب دن تھے وہ! بوسنیا کا وجود اس طرح لرزاں تھا جیسے وہاں سے کوئی بہت شدید قسم کا زلزلہ گذرا ہو' مگر زلزلے تو آکر چلے جاتے ہیں یہ کیسی تباہی تھی جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

جیمو کا دماغ طرح طرح کے سوالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

کہیں یہ قیدیوں کی بس کا سفر کسی اور بڑی مصیبت کا پیش خیمہ تو نہیں؟

جن لوگوں کو مارا پیٹا جا رہا ہے' ...... کیا قصور ہے ان کا؟

اور ان کا کیا قصور ہے جو دہشت بھری نظریں بس کے فرش پر جمائے اسے بے ارادہ گھورتے جا رہے ہیں؟ سربیا کی نئی حکومت کے پاس ان کے خلاف کوئی فرد جرم نہیں تھی سوائے اس کے کہ ان کا وجود سربوں کے لئے اس بات کی تکلیف دہ شہادت تھا کہ بوسنیا' سربوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور کروشیائی لوگوں کا بھی وطن ہے!

سربوں نے مسجدیں اور گرجا گھر گرانے کے ساتھ ساتھ ان قبرستانوں کو بھی کھودنے کا کام شروع کر رکھا تھا جو ان "غیروں" کی یادگار تھے۔ یہ منظم جرائم ماضی بعید کے ان تعصبات کے عکاس تھے جنہیں بظاہر ہمیشہ کے لئے فراموش کیا جا چکا تھا۔ یہ بے جواز نفرت ان کی روحوں کے تاریک تر گوشوں میں کہیں پلتی اور پھر ان کی خون آشام آنکھوں سے ٹپک ٹپک پڑتی تھی' زیادہ تر لوگ اس صورت حال میں خاموش تھے۔ مگر یہ خاموشی بہت سنگین تھی۔

بس امارسکا کی لوہے کی کان کے انتظامی بلاک کے باہر رکی جو کہ اسی نام کے گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر واقع تھی' ایک طرف زبردستی چھینے

ہوئے مویشی مسطح اور ہموار میدانوں میں چر رہے تھے جب کہ ان کی مخالف سمت میں کان کنی کا علاقہ جو چند دن پہلے تک مزدوروں سے بھرا رہتا تھا' دور تک ناقابل برداشت دھوپ میں جھلسا ہوا' ویران اور سنسان پڑا تھا' وسط میں دو بڑی بڑی عمارتیں تھیں جن کے درمیان ایک وسیع اور خوشنما قطعہ زمین پر دو چھوٹی چھوٹی تعمیرات دکھائی دے رہی تھیں' قیدیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بازو سر سے اوپر اٹھائے اور ہاتھوں کی تین تین انگلیاں مخصوص انداز میں کھولے ہوئے بسوں سے اتریں۔ دو رویہ کھڑے سرتا پا مسلح سپاہیوں نے ان کے گذرنے کے لئے ایک راستہ سا بنا دیا' پانچ قیدیوں کو اس گروہ سے الگ کر دیا گیا جبکہ باقی دو بڑی عمارتوں میں سے ایک میں لے جائے گئے۔ پانچ منتخب شدہ بدنصیبوں میں سے جیمو نے توفیق کو پہچان لیا جو پیشے کے اعتبار سے اداکار تھا لیکن عرف عام میں اسے ایک "مفت خور" کہا جاتا تھا' چند لمحوں بعد ہی گولیاں چلنے کی آواز آئی اور "توفیق مفت خور" کو سٹیج پر کرتب دکھانے سے ہمیشہ کے لئے فرصت مل گئی۔

ہر آنے والی بس سے اترنے والے بدنصیبوں کے ساتھ ساتھ قیدیوں کے کمرے کے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جیمو کا بیٹا' اس کے رشتے کے بھائیوں مرساد' فودو اور فودو کے بیٹے علی جان کے ساتھ آیا' جیمو کے اندازے کے مطابق شام تک بیس بسیں پہنچ چکی تھیں۔

اگلے روز بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا' ان دو دنوں میں پریجیڈور اور اس کے ملحقہ دیہاتوں سے کم و بیش تین ہزار لوگ اسی طرح کی کارروائیوں کے ذریعے اپنے اپنے گھروں سے گرفتار کر کے سربوں کی قائم کردہ امارسکا کی اس جیل میں لائے گئے ان قیدیوں میں جن کا واحد جرم

مسلمان یا کروشیائی ہونا تھا' ہر شعبہ ء زندگی کے لوگ شامل تھے۔ دانشور' استاد' انجینئر' پولیس والے' اہل حرفہ'....... ان میں پر یجیڈور کا میئر "عزت ماب" محمد قہاجک بھی شامل تھا۔ ایسے میں اس کا یہ خطاب کتنا عجیب لگ رہا تھا!

پہلے چار دن تک ان قیدیوں کو کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں دیا گیا' وہ ننگے فرش پر سوتے تھے' جیمو کو گتے کا ایک بڑا سا ڈبہ مل گیا جسے توڑ کر اس نے فرش پر بچھا لیا دونوں باپ بیٹا سونے کے لئے اسے بطور بستر استعمال کرتے تھے' فضا کے حبس کی وجہ سے ان کے گلے خشک ہو رہے تھے اور سانس لینے میں انتہائی دقت پیش آ رہی تھی۔ پانچویں دن انہیں کھانے کے لئے قطار بنانے کے لئے کہا گیا۔ بھوک برداشت کی حدوں سے گذر چکی تھی۔ سب لوگ دروازے کے قریب جمع ہو گئے' جہاں سے انہیں تیس تیس کے گروپس میں لے جایا گیا' ایری تیسرے گروپ میں تھا اور جیمو دسویں میں۔ جب جیمو کے گروپ کی باری آئی تو انہیں بتایا گیا کہ کھانا ختم ہو گیا ہے چنانچہ وہ بھوک کی شدت سے تڑپتے اور تلملاتے ہوئے اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ اس کے بعد سب کو روزانہ ایک وقت کھانا ملنا شروع ہو گیا جو عام طور پر گوبھی کے دو تین پتوں اور دال یا چنے کے دانوں پر مشتمل ہوتا تھا جو شوربہ نما نیم گرم پانی سے ڈھکے ہوتے تھے اس کے ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا ملتا تھا جو صابن کے جھاگ سے بنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ انہیں کھانے کے لئے صرف دو منٹ کا وقت ملتا تھا۔

کھانے کے لئے کنٹین پر آنے جانے کے دوران عام طور پر قیدیوں کو بلاوجہ زودکوب کیا جاتا تھا' ایک چکر دار راہداری سے گذرتے ہوئے وہ ایک

ایسے دوراہے پر پہنچتے جہاں سے دائیں طرف کو ایک سیڑھی اوپر کی طرف جاتی تھی، جہاں قیدی تفتیش کے لئے لے جائے جاتے تھے جبکہ بائیں طور پر کنٹین واقع تھی۔ پہرے پر متعین سپاہی راہداری کے پالش شدہ فرش کے ایک ادھڑے ہوئے ٹکڑے کو مزید پھسلواں بنانے کے لئے اس پر پانی پھینک دیا کرتے تھے جب کوئی قیدی اس جال میں پھنس کر پھسلتا وہ اس پر اس طرح ٹوٹ پڑتے جیسے بھوکے درندے نیم مردہ شکار کی چیر پھاڑ کرتے ہیں وہ بجلی کے تاروں کو بل دے کر بنائے گئے موٹے موٹے چابکوں کے ساتھ اس بدنصیب کو مارتے پیٹتے ہوئے دائیں طرف والی سیڑھیوں کے اوپر واقع تفتیشی کمرے میں لے جاتے جہاں تفتیش کے نام پر مزید وحشیانہ مارپیٹ اس کی منتظر ہوتی تھی۔

تفتیشی عملے کی موجودگی میں جو پریجیڈور پولیس کے افسران پر مشتمل تھا، محافظ عملے کے افراد، ان قیدیوں کو بوٹوں، پیتل کے گرز نما ہتھیاروں، لوہے کے ڈنڈوں اور دیگر طرح طرح کے آلات تشدد سے بے طرح مارتے تھے تاکہ ان سے زبردستی اعتراف جرم کرا کر پہلے سے تیار کئے ہوئے جھوٹے بیان پر دستخط کروائے جا سکیں۔ عام طور پر جن تین مبینہ جرائم کا اعتراف کروایا جاتا تھا وہ یہ تھے۔

1- انہوں نے پریجیڈور پر حملہ کرنے میں ذاتی طور پر حصہ لیا۔

2- ان کے پاس خفیہ ہتھیار ہیں۔

3- ان کے پاس ان سربوں کی فہرستیں پائی گئی ہیں جنہیں مسلمانوں نے ختم کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔

ان جھوٹے الزامات کے ثبوت اور شہادتیں حاصل کرنے کے لئے

انہوں نے ازخود اپنے آپکو اس ظلم و تشدد کی اجازت دے رکھی تھی اس سارے ڈرامے کا حقیقی مقصد قیدیوں کے حوصلے اور امید کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا تھا۔

کوزارک کے ایک نوجوان ڈاکٹر منصور کسوران سے ایک بیان پر دستخط کرنے کے لئے کہا گیا جس کے مطابق اس نے اقرار کیا تھا کہ اس نے سرکاری ہسپتال سے ادویات چرائیں' انہیں اپنے گھر کے تہہ خانے میں چھپا کر رکھا اور پھر انہیں مسلمانوں تک پہنچایا' ششدر اور پریشان منصور نے قسمیں کھا کر انہیں یقین دلایا کہ اس کا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور اس نے آج تک اپنے کلینک سے دوائی کی ایک خوراک بھی خوردبرد نہیں کی مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ اپنی موت کے اس پروانے پر دستخط کرنے کے بعد منصور کو یاد آیا کہ اس کے گھر میں تو سرے سے کوئی تہہ خانہ موجود ہی نہیں تھا۔ تفتیشی افسر نے اس کی وضاحت ہنسی میں اڑا دی اور محافظوں کو اسے لے جانے کے لئے کہا (امارسکا کیمپ میں محبوس ڈاکٹروں میں سے منصور واحد ڈاکٹر تھا جو زندہ بچ سکا)۔

اسی طرح ایسو محمد اجک پر' جو پریجیڈور کا ایک معزز شہری تھا' چھپ کر فائرنگ کرنے کا الزام لگایا گیا' الزام لگانے والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ایسو کی بینائی مسلسل ختم ہو رہی تھی اور وہ کسی سہارے کے بغیر سڑک پر چلنے کے بھی قابل نہیں تھا اور اس بات کو سارا شہر جانتا تھا۔

جیمو کی قیدگاہ میں تقریباً" چھ سو قیدی رکھے گئے تھے' یہ اصل میں کان کنوں کے کپڑے وغیرہ رکھنے اور بدلنے کا کمرہ تھا جو کوئی خاص کشادہ نہیں تھا' قیدیوں میں سب سے کم عمر ایک چودہ سالہ لڑکا تھا جو قریبی گاؤں بسکانی

سے لایا گیا تھا (اس کا سارا خاندان قتل کر دیا گیا تھا) اور سب سے عمر رسیدہ قیدی پریجیڈور سے ملحقہ سرجریک گاؤں کا چوہتر سالہ گر یلج تھا۔ جسے سب چچاگر یلج کہہ کر بلاتے تھے۔

ان چھ سو قیدیوں اور نوے مربع فٹ کے چھوٹے سے گیراج کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی اس گیراج میں مسلم اکثریتی آبادی والے قصبے کوزارک کے 160 قیدی رکھے گئے جو پریجیڈور سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر تھا ان لوگوں نے سربوں کے خلاف طویل ترین مزاحمت کی تھی جو محافظوں کے نزدیک ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ یہ ایک سو ساٹھ لوگ کوزارا کی پہاڑیوں میں بینکووک کے نواح سے پکڑے گئے تھے وہ مسلح تو تھے مگر مزید مزاحمت کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے بالآخر ہتھیار ڈال چکے تھے' ان کے اس اقدام کی وجہ ریڈیو سے نشر ہونے والا وہ اعلان تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے والوں کو مکمل تحفظ دیا جائے گا۔ کنکریٹ کے اس فرش پر ننگے پاؤں کھڑے اور چیتھڑے پہنے وہ واقعی "محفوظ" تھے!

ان کی تیز ار دلخراش چیخوں کو سننا ایک دہلا دینے والا عمل تھا' دن گرم اور راتیں حبس آلود اور تکلیف دہ تھیں کہ ان دنوں میں یہاں کا موسم ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ قیدی محافظوں سے پانی مانگتے تو وہ ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے کبھی کبھار ایک پلاسٹک کا بوتل نما ڈبہ سا نیچے پھینک دیا کرتے تھے' لب تر کرنے کے لئے پانی کے چند قطروں کا حصول زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا اور قیدی شدید پیاس سے نجات پانے کے لئے ایک ساتھ اس ڈبے پر جھپٹ پڑتے اور یوں جتنا پانی ان کے خشک اور جلتے ہوئے گلوں تک پہنچتا اس سے زیادہ زمین پر گر جاتا کچھ لوگ خالی ڈبے کو الٹا کر اسے اپنے کھلے ہوئے منہ

کے سامنے کر کے زور زور سے ہلاتے کہ شاید اس طرح کوئی بچا کھچا قطرہء آب ان کو میسر آ جائے۔

محافظ ایک تمسخر اور حقارت بھری ہنسی کے ساتھ قیدیوں کے سامنے پانی کی مزید فراہمی کے لئے یہ شرط رکھتے کہ وہ قوم پرست سربوں کے مخصوص گیت (جنہیں چیٹنک گیت کہا جاتا ہے) گا کر سنائیں اور یوں انہیں اس طرح کے گیت گانے پڑتے تھے۔

تم کہتے ہو سربیا چھوٹا ہے۔
تم سب جھوٹ بکتے ہو۔
سربیا چھوٹا نہیں ہے۔
تین دفعہ سربیا کے لوگ جنگ کے لئے۔
پٹولا سے راوناگورا تک گئے ہیں۔
اور جہاں جہاں تم دیکھو گے' وفادار محافظ موجود ہیں۔
ہمارے جنرل درازا کے وفادار محافظ ....!
او علی جاہ -------- او علی جاہ
جب ہم دوبدو ہوں گے۔
تو سب سے پہلے میں تمہی کو قتل کروں گا۔
میں خود تمہاری گردن کاٹوں گا۔
تم سے دنیا کو اسی طرح نجات دوں گا۔
جیسے کسی زمانے میں مائلوس نے مراد کا قلع قمع کیا تھا۔
دیکھو ترکوں کو مسجد میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھو!

....

"اور بلند! پانی چاہئے تو اپنی آواز کو اور بلند کرو" محافظ دھاڑتے۔

اور ان غم رسیدگان کے گیت کی لے بلند ہو جاتی۔

"ایک بار اور" محافظ ان کی بے بسی کا مزا لیتے ہوئے کہتے' "جتنے زور سے گاؤ گے اتنا زیادہ پانی ملے گا۔

اور وہ قسمت کے مارے درماندہ قیدی گھنٹوں اس اذیت کو دہراتے رہتے کہ شاید کسی طرح اس بے حد گرم رات کی وجہ سے ہمہ دم بڑھتی ہوئی پیاس سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے۔

قیدی رفع حاجت کے لئے ایک پلاسٹک کی ٹوکری استعمال کرتے جو گیراج کے ٹین والے دروازے کے ساتھ رکھی رہتی تھی جب کوئی شخص پیشاب کرتا تو باقی اپنے ہاتھوں کو اوک کی شکل میں لا کر اس کے گرد کھڑے ہو جاتے کہ شاید اس طرح کچھ پیشاب ان کے حصے میں آ جائے۔ وہ اس سے اپنے پپڑی زدہ خشک لبوں کو تر کرتے اور اسے پی جاتے۔ وہ کھڑے کھڑے سوتے تھے کیونکہ وہاں لیٹنے یا بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی جو دیوار کے نزدیک تر تھے وہ اپنے سر کو اوپر اٹھا کر دیوار کی سطح پر ٹکا دیتے گرمی اور فضا میں موجود رطوبت کی وجہ سے پلستر کا رنگ ان کی ہتھیلیوں سے پھسل پھسل کر ان کے بازوؤں اور بغلوں میں پھیل جاتا جس سے انہیں ایک مکروہ سی فرحت کا احساس ہوتا۔

ایک بار بغیر کسی وجہ اور سبب کے ایک نشے میں دھت محافظ نے گیراج کے دروازے پر مشین گن سے فائرنگ کر دی جیمو اور اس کے ساتھیوں نے قیدیوں کی چیخیں اور مدد کے لئے ان کی پکار سنی' کچھ دیر بعد یہ خبر پھیل گئی کہ چار قیدی شدید زخمی ہوئے ہیں اور ایک مارا گیا ہے' زخمیوں کو

ہسپتال یا شاید کسی اور جگہ لے جایا گیا لیکن پھر وہ دوبارہ نظر نہیں آئے۔

ایک بار جیمو کو ان گیراج میں محبوس بدحال قیدیوں کو اپنے دروازے کے کھلے ہونے کی وجہ سے' دیکھنے کا موقع مل گیا' دس منتخب قیدیوں کے ایک گروپ کو تقریباً" چالیس گز کے فاصلے پر لایا گیا' انہیں حکم دیا گیا کہ وہ سارے کپڑے اتار کر الف ننگے ہو جائیں۔ قیدیوں نے حکم کی تعمیل میں اپنے پھٹے پرانے چیتھڑوں جیسے کپڑے اتار کر ایک طرف ڈھیر کرنے شروع کر دیئے۔ محافظ' جن کی حرکات سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ نشے میں بڑی طرح دھت ہیں' ایک وحشیانہ انہماک کے ساتھ قیدیوں کو کپڑے اتارتے اور شرم کی وجہ سے اپنی عریانی کو ہاتھوں سے ڈھانپنے کی کوشش ناکام کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ایک قوی الجثہ قیدی نے جو تقریباً" چھ فٹ لمبا تھا کپڑے اتارنے سے انکار کر دیا اس کی لمبی جھاڑ جھنکار جیسی داڑھی سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ قید میں خاصی طویل مدت کاٹ چکا ہے' وہ زمین پر نظریں جھکائے اور سر نیوڑائے خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا تھا ایک محافظ نے بندوق کی نالی اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اس سے کچھ کہا' قیدی بغیر کوئی ردعمل ظاہر کئے اسی طرح کھڑا رہا۔

"اس غریب کی شامت آگئی ہے اب یہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے' جیمو کے عقب سے کسی کی خوفزدہ آواز ابھری۔ جیمو نے نہ تو مڑ کر بولنے والے کی طرف دیکھا اور نہ ہی اس تبصرے پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا وہ اس شیشے کے دروازے کے بالائی حصے سے باہر کی طرف دیکھتا رہا جو قیدیوں اور محافظوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا تھا' وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس انکاری

اور کوزارک کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔

محافظ نے جب یہ دیکھا کہ قیدی اپنے ارادے میں مستحکم ہے اور اس کے احکامات کی تعمیل نہیں کر رہا تو اس نے بندوق کا رخ اوپر کی طرف کر کے ایک ساتھ بہت سے فائر داغ دیئے لیکن سوائے اس کے کہ قریبی درخت پر بیٹھی ہوئی چند چڑیاں اور کونجیں گھبرا کر اڑ گئیں' اور کچھ نہ ہوا----- قیدی اسی استقامت بھرے انداز میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے بغیر وہیں کھڑا رہا۔ ابھی بندوق کی نالی سے نکلنے والا نیلا دھواں ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محافظ نے یکے بعد دیگرے بندوق کے بٹ سے اس کے سر پر وحشیانہ ضربیں لگانا شروع کر دیں یہاں تک کہ قیدی زمین پر گر گیا محافظ نے بندوق اپنے ساتھی کے حوالے کی اور اپنی پتلون کی بیلٹ سے لگے ہولسٹر سے ایک چمکتے ہوئے پھل والا لمبا فوجی چاقو نکالا۔

اس نے جھک کر زمین پر گرے قیدی کو بالوں سے اٹھایا' اس عمل میں اس کے ساتھ ایک اور چاقو بدست گارڈ بھی شامل ہو گیا وہ دونوں قیدی کو گندی گندی گالیاں دے رہے تھے' باقی کے دو گارڈ ذرا سا پیچھے ہٹ گئے لیکن ان کی بندوقوں کی نالیں حسب معمول باقی ماندہ قیدیوں کی طرف اٹھی رہیں جن کی ہر حرکت پر وہ مستعدی سے نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ پہلے دو محافظوں نے بظاہر جھک کر چاقوؤں کے ساتھ گرے ہوئے قیدی کے جسم پر موجود چیتھڑوں کو کاٹنا شروع کیا لیکن چند لمحوں بعد جب وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو ان کے اپنے لباس بری طرح خون آلود ہو چکے تھے۔ ہوا میں ایک ایسی طویل بلند اور دردناک چیخ کی بازگشت گونج رہی تھی جس سن کر سب لوگ بری طرح دہشت زدہ ہو گئے۔

جیمو نے اپنی ساری زندگی میں ایسا ہولناک منظر نہیں دیکھا تھا' بدنصیب قیدی نے زمین سے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا' وہ اپنی چیخیں روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور اس کا پورا وجود لہو میں شرابور تھا' ایک گارڈ نے نزدیکی آب گاہ سے جڑا ہوا ایک پائپ اٹھایا اور اس کا رخ قیدی کی طرف کر کے پانی کی انتہائی تیز اور موٹی دھار اس پر پھینکی۔ خون اور پانی کا ایک آمیزہ سا اس کے کٹے پھٹے' وحشت ناک اور ننگے بدن سے نیچے کی طرف بہنے لگا وہ اپنے جنوں جیسے بھاری بھرکم وجود کو اس حملے سے بچانے کے لئے کبھی جھک جاتا' کبھی اپنے بازو سر سے اوپر اٹھا لیتا اور کبھی انہیں نیچے جھکا کر اس تیز اور طوفانی دھار کو روکنے کی کوشش کرتا اس کی چیخوں میں شدت درد کی وجہ سے اب پاگلوں جیسی وحشت شامل ہو گئی تھی اور پھر جیمو اور وہاں پر موجود تمام لوگوں نے دیکھا کہ محافظوں کے چاقوؤں نے اس کے ساتھ اصل میں کیا کیا تھا انہوں نے اس کا عضو تناسل کاٹ دیا تھا اس کے علاوہ اس کی پیٹھ کا ایک حصہ بھی کٹ چکا تھا۔

اس انتہائی ہولناک اور وحشت انگیز نظارے نے چند لمحوں کے لئے جیمو کے حواس اس قدر مختل کر دیئے کہ اسے بعد کے واقعات کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ اس پر تشدد ہلاکت کے بعد قیدی کی لاش کو ایک کوڑے کے ڈرم میں پھینک کر اس پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی اور باقی قیدی گیراج میں واپس بھیج دیئے گئے تھے۔

تفتیش کے آغاز کے ساتھ ہی گیراج بتدریج خالی ہونے لگا اور بالآخر صرف پچاس کے قریب قیدی وہاں رہ گئے جو اس بدنام زمانہ موت گھر نما گیراج میں ہونے والے ہولناک مظالم کے عینی گواہ تھے۔

ایک مسلسل دہشت قیدیوں کی ہڈیوں میں گھستی چلی جا رہی تھی اور ان کے مجروح بدن اس ذلت اور تشدد کو برداشت کرتے کرتے ایک ایسی حالت میں داخل ہو چکے تھے جہاں ہر قسم کا احساس ختم ہونے لگتا ہے۔ دن گذرتے گئے' آنے والا ہر دن پہلے گذرے ہوئے دنوں جیسا تھا اور یہی صورت بعد میں آنے والے دنوں کی تھی' حبس بھرے گرم دن' اس کے بعد بارش اور پھر مزید بارش کے ساتھ آنے والا حبس اور شدید گرمی۔ نحیف و نزار بدن نحیف تر ہوتے چلے گئے' پیلے اور مدقوق چہروں پر ناقابل برداشت درد کی شدت جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی وہ ذہنی سکون کی مکمل تباہی اور حرمت انسانی کی بدترین اور ناقابل تلافی تذلیل کے جس عمل سے گذر رہے تھے وہ اب علاج کی حدوں سے باہر ہوتا جا رہا تھا' وہ اس تنگ اور محدود جگہ پر بھی چلنے پھرنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کے ناتواں جسم اپنی بقا کے لئے توانائی کا ایک ایک ذرہ بچانا چاہتے تھے' وہ دیوار کے ساتھ قطاروں میں اپنے گتے کے بچھونوں اور چیتھڑوں جیسی جیکٹوں اور سویٹروں میں سمٹے ہوئے یوں پڑے رہتے جیسے ان کے جسموں کو تاریکی میں حنوط کر دیا گیا ہو انہوں نے بولنا تقریباً" چھوڑ دیا تھا کیونکہ ان کے خیال میں یہ بھی توانائی بچانے کا ایک طریقہ تھا اس رو میں شاید وہ یہ بھی بھول جاتے تھے کہ تقدیر ان پر کیا کیا ستم ڈھا چکی ہے' وہ اب بھی کہتے تھے کہ انہیں اس دوزخ کے پاتال سے ایک دن رہائی مل جائے گی' ان کی داڑھیاں بڑھتی جا رہی تھی اور الجھے ہوئے بال تیزی سے سفید اور بھورے ہو رہے تھے۔

دیکھا جائے تو ان حالات میں بال بنانے کے بارے میں سوچنے کی فرصت بھی کسے تھی؟ انہیں برشوں کی ضرورت تو تھی مگر صفائی اور خود نمائی

کے لئے نہیں بلکہ ایک ایسی جنگ لڑنے کے لئے جس میں غنیم نے انہیں بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ یہ غنیم وہ جوئیں تھیں' جو نہانے دھونے کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے قیدیوں کی جان کو آ گئی تھیں۔ شروع شروع میں وہ جوئیں پکڑتے اور ارد گرد کے لوگوں سے نظریں بچا کر انہیں اپنے ناخنوں میں دبا کر مار دیتے' اس کے بعد یوں ہونے لگا کہ وہ جب بھی سر کو ذرا سا ہلاتے جوئیں خود بخود جھڑنے لگتیں قیدی ایک دوسرے کے سروں سے جوئیں پکڑ پکڑ کر ان مفت کے خون پینے والوں کو مارتے رہتے اور کہتے۔

"پہلے سے موجود دشمن کے ساتھ اب ایک نیا دشمن بھی محاذ پر آ گیا ہے"

کچھ عرصے کے بعد یہ جوئیں ان کے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی داخل ہو گئیں۔ راتیں بہت تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے یہ کبھی ختم نہ ہوں گی بے کسی اور بے بسی کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ ہمہ وقت اپنے بغلوں' بدن کے دوسرے حصوں اور خالی معدوں کو ایک بے چارگی کے عالم میں کھجاتے رہتے تھے۔

تیسرا باب

باہر سے آنے والی گولیوں کی آوازیں' چیخیں اور مار پیٹ کا شور --- شام کی حاضری ---- یوں لگتا تھا جیسے اس ہولناک تسلسل سے باہر زندگی کا کوئی اور تصور باقی ہی نہیں رہا۔

آدھی رات کے بعد' صبح کاذب کے ہنگامے میں' روزانہ ایک گارڈ بلا دیکھے دروازے کے قریب لیٹے بیٹھے لوگوں پر ایک جنون کے عالم میں حملہ آور ہو جاتا اور اس کی سناٹے کو توڑتی ہوئی کرخت آواز فضا میں گونج اٹھتی ----- "سب لوگ کھڑے ہو جاؤ" ہر جاگنے والا اپنے ساتھ والے کو ہوشیار کرتا اور یوں کچھ ہی دیر میں سارے قیدی جاگ جاتے' گارڈ ایک یا ایک سے زیادہ قیدیوں کے نام کے ابتدائی اور آخری حصے پکارتا اور پھر انہیں اپنے ساتھ باہر آنے کا حکم دیتا' گھنٹے آدھے گھنٹے بعد یہ لوگ دروازے سے ریت کے بوروں کی طرح واپس پھینک دیئے جاتے' تشدد کی وجہ سے ان کے بازو اور ٹانگیں شکستہ اور خون سے بھرے ہوتے بلکہ کبھی کبھی تو ٹوٹی ہوئی ہڈیاں کھال سے باہر جھانک رہی ہوتی تھیں جس جس سے جو جو بن پڑتا ان کی مدد اور دیکھ بھال کے لئے کرتا' پھٹے پرانے کپڑے کے ٹکڑوں کو گیلا کر کے زخموں پر باندھا جاتا اور ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں کو باندھنے کے لئے پرانی قمیضیں اور زیر جامے استعمال کئے جاتے قیدی دروازے پر لگی ہوئی پلائی وڈ اتار کر اس کے ٹکڑوں سے کھپچیاں بناتے جن سے ہڈیوں کو جوڑنے کا کام لیا جاتا تھا' راتوں کو ہونے والی اس مار پیٹ نے قیدیوں کی نفسیات پر بھی نہ مندمل ہونے والے گھاؤ ڈال دیئے تھے اور وہ روز بروز خاموش تر اور دروں بیں ہوتے جا رہے

تھے۔

کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر ایسو صادقووچ' جو ناک کان اور گلے کے علاج میں خصوصی شہرت رکھتا تھا اور پر ئیبیڈور کے ہسپتال میں اپنے شعبے کا انچارج تھا' وہاں لایا گیا' علاقے کے لوگ اس کی فنی مہارت اور شخصی حسن اخلاق کی وجہ سے اسے بے حد پسند کرتے تھے ڈاکٹر ایسو صادقووچ کئی برس تک اقوام متحدہ کے اداروں میں ایک خصوصی مشیر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد چند برس قبل ہی وطن کی محبت سے مجبور ہو کر واپس آیا تھا۔

موجودہ صورت حال کے ظہور ہونے سے پہلے وہ اکثر ریڈیو پر محبت' بھائی چارے' امن اور باہمی افہام و تفہیم کے موضوع پر تقریریں کیا کرتا تھا لیکن اب سربوں کو اس کی انہی مخلصانہ باتوں میں بھی نئے نئے معنی نظر آنے لگے تھے اسے اس کے گھر سے گرفتار کر کے امارسکا کے اس کیمپ میں لایا گیا تھا۔

لیکن اس افتاد کے باوجود بھی ڈاکٹر صادقووچ ہمیشہ کی طرح کیمپ کے اندر باہر ہر ایک کی مدد کے لئے مستعد رہتا تھا یہاں تک کہ گارڈ بھی اپنے ان زخموں کے سلسلے میں اس کی مدد حاصل کرتے تھے جن کی وجہ' ان کے بے معنی اور احمقانہ جوش کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کیونکہ وہ اکثر اپنی رائفلوں کے حفاظتی کھٹکے لگا کر نہیں رکھتے تھے اور انگلیوں کی بے چین حرکات کے باعث اچانک رائفل چل جانے سے زخمی ہو جاتے تھے وہ اپنی رائفلیں کندھوں پر لٹکا کر رکھتے تھے اور نال کا رخ نیچے کی طرف ہونے کی وجہ سے اکثر گولیاں ان کے پاؤں اور ٹانگوں پر لگتی تھیں گارڈز کے علاج کے لئے ڈاکٹر کو ہر طرح کا طبی سامان فراہم کیا جاتا تھا مگر قیدیوں کو ابتدائی طبی امداد تک مہیا نہیں کی جاتی

تھی۔

ایک دفعہ جیمو نے ڈاکٹر صادقووچ کو خون میں تر بتر ایک قیدی کے سر پر ٹانکے لگاتے ہوئے دیکھا جسے کنٹین سے واپسی پر کسی گارڈ نے اپنی وحشیانہ مستی میں ایک لوہے کے راڈ سے بری طرح زخمی کر دیا تھا' ڈاکٹر نے زخم سینے کے بعد بتایا کہ قیدی کے سر میں اس کے پورے جسم کے کسی بھی حصے سے زیادہ خون موجود تھا یہ زخم اس نے ایک کپڑے سینے والے سوئی اور عام دھاگے کے ساتھ سیا کہ اس کے سوا وہاں اور کچھ میسر نہ تھا زخمی قیدی نے جس اذیت کے ساتھ دانت بھینچ کر یہ ٹانکے لگوائے وہ منظر دیدنی تھا۔

ڈاکٹر' امارسکا کیمپ کے دوسرے حصوں کے علاوہ چالیس کے قریب ان قیدی عورتوں کا بھی معالج تھا جن میں وہ سرب عورتیں بھی شامل تھیں جن کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے سرب فوجیوں اور رضاکاروں کے اس ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کیا تھا جو وہ اپنے صدیوں پرانے ہمسایوں پر روا رکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک جیمو کی ہمسائی جووانکا تھی جو اسی عمارت میں رہتی تھی جہاں سے جیمو اور اس کے دیگر ہمسائے گرفتار کر کے اس کیمپ میں لائے گئے تھے۔

عورتیں جیمو کے کمرے کے اوپر واقع بالکونی میں سوتی تھیں۔ یہی بالکونی دن کے وقت تفتیش کے لئے استعمال کی جاتی تھی' ان تفتیشی اوقات کے دوران عورتوں کو باورچی خانے میں بھیج دیا جاتا تھا' ان میں سے کچھ کھانا پکانے' اسے تقسیم کرنے اور برتن دھونے کا کام کرتی تھیں اور باقی سب سارا دن وہیں خاموش بیٹھی کھانے کے دوران قیدیوں کو گالیاں کھاتے دیکھتی رہتی تھیں۔ جیمو نے دیکھا کہ بارہا جووانکا کنٹین سے واپس جاتے ہوئے ایری کے

ہاتھ میں چپکے سے کچھ تھما دیتی تھی۔ عام طور پر یہ کوئی روٹی کا ٹکڑا ہوتا تھا البتہ ایک بار اس نے اسے چاکلیٹ کا ٹکڑا بھی دیا جس کے لئے جیمو نے ممنویت میں سرہلا کر' تشکر کا اظہار کیا۔

ان قیدی عورتوں میں مقامی عدالت کی جج نسکا' دانتوں کی ڈاکٹر بیبا اور صحافی خاتون جندرانکا کو جیمو پہلے سے جانتا تھا' ایک عورت کے ایلوس اور انیس نامی دو لڑکے تھے جنہیں وہ چوری چھپے کچھ نہ کچھ کھانے کی چیزیں دیتی رہتی تھی' یہ خاندان جیمو کے قید خانے والے کمرے میں ہی رہتا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی نسبتاً" رحمدل گارڈ اس عورت کو اپنے بچوں کی پلیٹ میں کچھ زیادہ خوراک یا روٹی کا ایک آدھ اضافی ٹکڑا ڈالنے کی اجازت دے دیتا۔

حاجرہ نامی ایک عورت کو تقریباً" پچاس دوسرے قیدیوں کے ساتھ " وائٹ ہاؤس" نامی ایک قید خانے میں رکھا گیا۔ عقوبت خانے کو "وائٹ ہاؤس " کا نام دینا ان سربوں کا ہی کام تھا۔ یہاں قیدیوں پر بدترین قسم کا تشدد کیا جاتا تھا' اس کا بیرونی حصہ واقعی سفید رنگ کا تھا' یہ چار درمیانے سائز کے کمروں پر مشتمل عمارت کا وہ حصہ تھا جو باورچی خانہ سے بالکل ملحق تھا' اس میں ایک غسل خانہ بھی تھا مگر وہ صرف محافظوں کے استعمال میں رہتا تھا' حاجات ضروریہ سے فراغت کے لئے یہاں کے قیدیوں کو باہر کھیتوں میں لے جایا جاتا تھا' گارڈز کبھی انہیں چار چار پانچ پانچ کے گروپس کی شکل میں اور کبھی ایک ایک کر کے اپنی مرضی سے باہر لے جاتے تھے بعض قیدیوں کو اسی چکر میں موت کا منہ دیکھنا پڑا۔

بارش کی ایک رات میں محمد علی جاہ سراج لک کو باہر آنے کے لئے کہا گیا' یہ ساٹھ برس کا ایک معزز' سفید سروالا معتبر آدمی تھا' پہلے اسے باہر لے

جا کر ننگا ہونے کا حکم دیا گیا اور پھر اسی برہنہ حالت میں وہ لوگ اسے حاجرہ کے ساتھ واپس اندر کمرے میں لے آئے' حاجرہ کی عمر بمشکل بائیس تیئس برس کی ہو گی اس کے بھی کپڑے اتروائے گئے اور پھر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ان تمام قیدیوں کے سامنے ایک دوسرے سے مباشرت کر کے دکھائیں جو ایک دہشت آمیز خاموشی میں ان دونوں مجبور اور بے بس مرد و زن کی بے حرمتی کا یہ روح فرسا منظر دیکھ رہے تھے' محمد علی جاہ نے محافظوں کی بہت منت سماجت کی' ہر طرح کے واسطے دیئے کہ وہ اس حرکت سے باز آ جائیں کیونکہ حاجرہ عمر کے اعتبار سے اس کی پوتیوں جیسی تھی۔ محافظ آدم خوروں کی طرح وحشیانہ انداز میں ہنس کر بولے۔

"دیکھو یہ بڈھا کیسے نخرے کر رہا ہے۔ ہمارے پاس اس وقت اس سے کم عمر لڑکی موجود نہیں اگر یہ ہمارے کام آ سکتی ہے تو یقیناً" تمہارے لئے بھی ٹھیک ہی رہے گی"

بے چاری لڑکی اس دوران میں اپنے ہاتھوں سے اپنی برہنگی چھپانے کی عاجزانہ سی کوشش کرتی رہی اور بار بار التجا کرتی رہی کہ اسے کپڑے پہننے کی اجازت دے دی جائے۔

"نہیں ---- ہرگز نہیں" ایک گارڈ نے انتہائی بے حیائی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"ابھی یہ بڈھا رضامند ہو جائے گا۔ اسے ہونا ہی پڑے گا"۔

اس کے بعد اس نے اپنے ساتھی محافظوں سے کہا کہ وہ اسے باہر بارش میں لے جائیں اور جب تک وہ ان کے وحشیانہ حکم کی تعمیل پر آمادہ نہیں ہو جاتا اسے وہیں رکھا جائے۔

محمد علی جاہ کو اس شدید سردی اور طوفانی رات میں، جب کہ پورے گرم کپڑوں کے ساتھ بھی باہر نکلنا مشکل تھا دو گھنٹے بارش میں ننگا کھڑا کرنے کے بعد انتہائی برے حالوں میں واپس لایا گیا لیکن اس کے دوبارہ انکار پر مشتعل ہو کر انہوں نے اسے رائفل کے بٹ اور فوجی بوٹوں کی بھاری ٹھوکروں کے ساتھ بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ بے دم ہو کر زمین پر گر گیا۔

"اس نجاست کی پوٹ کو باہر پھینک دو" ایک گارڈ چلایا۔

محمد علی جاہ کو داخلے کے دروازے کے دائیں طرف کی کھلی جگہ پر لے جا کر چھوڑ دیا گیا جہاں سے صبح اس کی اکڑی ہوئی لاش ملی۔

وائٹ ہاؤس کا سب سے بدنام اور خطرناک اذیت دہندہ زوکا نامی ایک سپاہی تھا اس کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام سرب فوج کا سب سے زیادہ طاقت ور سپاہی ہے، وہ عام طور پر ہاتھ میں لوہے کے تاروں سے بنا ہوا ایک تین فٹ لمبا چابک سا رکھتا تھا جس کے دوسرے سرے پر فولاد کا ایک بہت موٹا کیل جوڑ دیا گیا تھا یہ ایک باہر کو نکلا ہوا نوکیلے سرے والا کئی انچ لمبا کیل تھا وہ اس آہنی چابک کو قیدیوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے وحشیانہ انداز میں گھماتا رہتا تھا اور اچانک کسی قیدی کے سامنے رک کر اس سے کہتا "تمہیں اپنی کون سی آنکھ زیادہ پسند ہے؟"

پھر وہ سفاکانہ انداز میں اس کے جسم کے خفیہ حصوں پر نگاہ دوڑاتا اور کہتا "کون سا خصیہ ......!!" ایک بار اس نے ایسا ہی ایک نسبتاً" چھوٹا کیل ایک نوجوان قیدی کی ایڑی میں پیوست کر دیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے یہ کیل نکالنے کی کوشش کی تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

کچھ دنوں بعد وہ نوجوان شدید اذیت کے عالم میں دم توڑ گیا۔

قیدیوں سے پیسے' گھڑیاں اور کوئی بھی قابل استعمال چیز چھیننا ان محافظوں کا روز کا معمول تھا' یہ رسم صرف وائٹ ہاؤس تک محدود نہیں تھی' قیدیوں کے تمام بندی خانوں میں یہی سلسلہ چلتا تھا جو تعداد میں دس تھے کچھ قیدیوں کے لئے سگرٹوں کا چھن جانا خوراک نہ ملنے سے زیادہ تکلیف دہ تھا' اچانک کوئی گارڈ آتا اور اعلان کرتا' "دس منٹ کے اندر اندر میرے لئے دو سو جرمن مارک جمع کر کے رکھو' ایسا نہیں ہوا تو دروازے کے قریب والے دس قیدی بھون کر رکھ دوں گا"

اس کے بعد وہ قیدیوں کو کچھ کہنے یا یہ وضاحت کا موقع دیئے بغیر تیزی سے واپس مڑ جاتا کہ ان کے پاس اب کچھ نہیں بچا اور جو کچھ تھا وہ پہلے سے چھینا جا چکا ہے۔

قیدی اپنی جیبوں کے کونے کھدروں میں ہاتھ مارتے اور جو کچھ ملتا وہ ان دس قیدیوں کے حوالے کر دیتے جنہیں موت کی دھمکی دی جا چکی تھی۔ عام طور پر یہ جمع جتھا مطلوبہ رقم سے بہت کم ہوتا تھا واپسی پر گارڈ پانچ چھ کلائی کی گھڑیوں پر راضی ہو جاتا' ان کی پسند سیکو گھڑیاں تھیں۔

بہت سے گارڈز نے قیدیوں میں سے ہی گماشتے مقرر کر رکھے تھے جو بازار سے دس گنا قیمت پر ان کے ہاتھ سگریٹ اور بسکٹ فروخت کرتے تھے بعض اوقات وہ لوگ ایک ڈرامہ کرتے تھے یعنی کوئی گارڈ کسی قیدی کو سگرٹوں کا ایک بڑا کارٹن دے کر جاتا کہ اسے اس کی بتائی ہوئی قیمت پر فروخت کر دیا جائے ...... کچھ وقفے کے بعد کوئی اور گارڈ جیسے اچانک آ جاتا اور سارے سگریٹ چھین کر لے جاتا۔ تقریباً" ایک گھنٹے کے بعد وہی پہلے والا گارڈ واپس

آتا اور یوں بن کر جیسے اسے کسی بات کا پتہ ہی نہ ہو' متعلقہ قیدی سے اپنے دیئے ہوئے سگرٹوں سے حاصل شدہ رقم کا تقاضا کرتا قیدی لاکھ وضاحتیں کرتا اور اپنی بے گناہی کی دہائیاں دیتا مگر کوئی چیز اس کو ایک وحشیانہ سزا سے نہیں بچا سکتی تھی۔

امارسکا کیمپ میں سگرٹوں کی اپنی ایک الگ داستان تھی۔ عادی سگریٹ نوش' اپنے سگریٹ ختم ہونے کے بعد دیوانوں کی طرح ان لوگوں کے گرد ہو جاتے جن کے پاس سگریٹ موجود ہوں اور پھر ایک ایک کش کے لئے منتوں اور التجاؤں کے ڈھیر لگا دیتے بعض اوقات دس دس لوگ ایک ہی سگریٹ کو باری باری پیتے تھے ہر کسی کے حصے میں ایک یا دو کش ہی آتے اور زیادہ لمبا کش لینے والے کو باقی سب کی سخت ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ کچھ زیادہ ہی ٹوٹے ہوئے ایسے بھی تھے جو اس امید پر منہ کھول کر سگریٹ نوشوں کے قریب و جوار میں پھرتے رہتے کہ اس طرح وہ ان کے چھوڑے ہوئے دھوئیں سے ہی لطف اندوز ہو لیں گے بعض اوقات کسی کے پاس بھی سگریٹ نہ ہوتا تو قیدی انگلیوں کو جوڑ کر اس طرح اپنے ہونٹوں کے نزدیک لاتے اور سانس اندر کی طرف کھینچتے جیسے ان میں سگریٹ دبا ہو۔

قیدی سگرٹوں کے بچے کھچے ٹوٹے جمع کرتے جن کی لمبائی عام طور پر ایک انچ سے بھی کم ہوتی اور پھر انتہائی کمال اور مہارت سے اپنی انگلیاں جلائے بغیر ان میں سے وہ کش کھینچتے جو بظاہر ناممکن نظر آتے تھے کبھی کبھی وہ ان ٹوٹوں میں سے تمباکو کے ریزے نکال کر جمع کرتے اور پھر انہیں پرانے اخباری کاغذ کے ٹکڑوں میں لپیٹ کر خانہ ساز سگرٹوں کی شکل میں پی جاتے۔

کچھ عرصے کے بعد جب محافظوں نے بھاری پہرے میں ان کو قید خانوں سے

نکال کر باہر کھلے میں لے جانا شروع کیا تو قیدی گھاس کے تنکے توڑ توڑ کر انہیں سورج کی روشنی میں خشک کرتے اور پھر انہیں تمباکو کی طرح سگریٹ بنا کر پی جاتے۔

جیمو والے قید خانے میں موجو کرنالک نامی ایک باڈی بلڈر ٹائپ نوجوان سب سے زیادہ سگریٹ اور بسکٹ فروخت کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے دوسرے کمرں کے قیدیوں نے ان کے کمرۂ قید کو "موجو کی جیل" کہنا شروع کر دیا تھا موجو کی ذمہ داریوں میں سے اپنے ساتھی قیدیوں کی روزانہ گنتی اور انہیں کھانے کے لئے قطار میں کھڑا کرنے کے فرائض بھی شامل تھے اس کام میں برہو کیپٹینووچ نامی ایک شخص اس کی معاونت کرتا تھا جو گرفتار ہونے سے پہلے امارسکا ہی کی کانوں میں بطور کان کن کام کیا کرتا تھا۔ اکثر راتوں کو گارڈ موجو کو باہر بلواتے' وہ بے دلی سے اٹھتا' سردی سے بچنے کے لئے کچھ مزید کپڑے پہنتا اور باہر نکل جاتا کچھ دیر بعد وہ سگرٹوں اور بسکٹوں کے ڈبوں سے لدا پھندا آتا اور آتے ہی ان کی فروخت کا سلسلہ شروع کر دیتا' محرم مرسلووک مرسل جو شہر کے ایک مشہور ریسٹورنٹ کا مالک تھا اس کا پکا گاہک تھا جو اس سے سگریٹ خرید کر ان قیدیوں میں تقسیم کر دیتا جو انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے قیدیوں کی حریصانہ نظریں جس طرح مسلسل موجو کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے سگرٹوں اور بسکٹوں کا طواف کرتیں وہ اپنی جگہ پر ایک تماشہ تھا۔

موجو' محافظوں کو "کامریڈ سرجنٹ" کہہ کر مخاطب کرتا تھا' باقی قیدی اس بے تکلفی کی جرات صرف ان چند ایک مواقع پر ہی کرپاتے تھے جب کوئی گارڈ اچھے موڈ میں ہوتا۔ ایک غیر معمولی حبس بھری رات میں آدھی

رات گئے ایک "کامریڈ سرجنٹ" نے موجو کو باہر بلایا خوبصورت ورزشی جسم والے موجو نے معمول کے انداز میں ایک جرسی اٹھا کر پہنی اور باہر چلا گیا۔ پھر کبھی واپس نہ آنے کے لئے ....!

آئندہ چند دنوں تک ان کا معاون برہو اس کی جگہ لیتا رہا لیکن پھر ایک رات اس کے ساتھ بھی وہی ہوا جو موجو کے ساتھ ہو چکا تھا۔ برہو کا بھائی محمد علی جاہ بھی جو پریجیڈور کی ایک سامان ضیافت مہیا کرنے والی کمپنی میں مینجر تھا انہی لوگوں میں شامل تھا جو راتوں کو ہونے والی طلبی کے نتیجے میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ اس کے علاوہ ریسٹورنٹ کا مالک زیکو کرنالک اور اس کا بیٹا ارمین پریجیڈور کے تجارتی ادارے بوسنا مونٹازا کا ڈائریکٹر زلاجا بیرووچ' شہر کے سب سے مقبول کیفے کا مالک آصف کیپٹینووچ' پریجیڈور کی عدالت انصاف کا صدر ندزاد سیرک' یوسف پاسک' رفاد سلجانووچ عثمان مملجن اور زیلجیکو سکورا بھی ہمیشہ کے لئے صفحہء ہستی سے مٹا دیئے گئے۔

امارسکا کیمپ کے بند ہونے سے صرف ایک رات قبل ڈاکٹر ایسو صادقووچ کو آواز پڑی۔ اس نے اپنا سارا طبی سامان' جو ایک چھوٹے سے پلاسٹک بیگ میں سمٹ جاتا تھا' اٹھایا اور بہت آہستگی سے رات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں گم ہو گیا' دروازے کے قریب والے لوگوں نے اسے ایک فوجی گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا' عین اسی وقت شہر کے وسط میں قائم کیراترم کیمپ سے لائے گئے دو قیدیوں کو بسوں میں لاد کر کہیں بھیجا گیا۔ یہ کیمپ آج ہی خالی ہوا تھا اور محافظوں کے کہنے کے مطابق یہ قیدی اس کیمپ کے سب سے سخت جان کیس تھے۔ ڈاکٹر صادقووچ کے معاملے میں واحد حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اسے بس کی بجائے فوجی گاڑی میں سوار کرایا گیا تھا

اور یوں ایک موہوم سی توقع تھی کہ شاید اس کا بچ بچا ہو جائے اس کی بیوی' بیٹا اور بیٹی اس سارے عرصے میں پر بیجنڈور ہی میں مقیم رہے۔

ہر طرف ایک خاموشی تھی۔ کیونکہ خاموشی ہی وہ واحد چیز تھی جسے وہاں ممنوع قرار نہیں دیا گیا تھا۔ یہ خاموشی اس فضا کی خوفناکی اور ناقابل برداشت بے بسی سے پناہ کا ایک پردہ تھی جس کی آڑ میں قیدی اپنی اذیت کو چند لمحوں کے لئے ہی سہی' فراموش کرنے میں کوشاں رہتے تھے' جیمو' ایک طویل سرد آہ بھر کا حسرت بھری نظروں سے دور تک پھیلے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھتا اور جیسے اپنے آپ سے باآواز بلند سرگوشی کرتا "وہ رہا میرا پر بیجنڈورا!"

اور پھر دھیرے سے بڑبڑاتا ---- "کیا میں اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا؟"

اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھر جاتا' قریب ہی سے کسی کی ایسی دبی دبی آواز آتی کہ جسے محافظ نہ سن سکیں۔

"یہ ہم سب کو ختم نہیں کر سکتے ---! کوئی نہ کوئی بہت جلد ان کے مظالم کو طشت ازبام کر دے گا کیونکہ بھیڑیئے اپنا سراغ ضرور چھوڑ جاتے ہیں' انہوں نے کزارا پہاڑی اور اس کی وادیوں کو جس طرح اجاڑا اور ان کی بے حرمتی کی ہے' کوئی بھی' یہاں تک کہ خدا بھی' ان کو معاف نہیں کر سکتا۔"

بعض راتوں میں نیند کے مختصر وقفے کے دوران یکدم کوئی قیدی ہڑبڑا کر اٹھتا اور مجنونانہ انداز میں بولنے اور چیخنے لگ جاتا' ایک بار طلوع سحر سے ذرا پہلے ان کی نیند اور کمرے کی خاموشی ٹوٹی" کوئی انتہائی بلند آواز میں پکار رہا تھا۔

"دوستو! سنو' ہم سب زندہ لاشیں ہیں"۔

یہ بلانوش شرابی ہاجو کی آواز تھی جو طبعاً" ایک بہت نیک دل اور

ایماندار انسان تھا اور فائر بریگیڈ کے محکمے سے ابطور ڈرائیور ریٹائر ہوا تھا' اسے تو کچھ دیر بعد سمجھا بجھا کر خاموش کرا دیا گیا مگر اس کے کہے ہوئے الفاظ بہت دنوں تک ان کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ایک دن جب وہ قطار بنا کر کینٹین سے اپنے زندان کی طرف جا رہے تھے ہاجو نے یکدم کھلے میدان کی طرف رخ کر کے چلنا شروع کر دیا' ایک گارڈ نے رائفل اٹھا کر نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ ہاجو لڑکھڑایا اور گر گیا' بعد میں معلوم ہوا کہ گولی اس کے کندھے پر لگی تھی اور وہ بچ گیا تھا گارڈ انہیں اکثر ڈراوے دیتے۔

"اگر تمہیں یہاں کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تو باہر نکل جاؤ .... باقی کام ہم سنبھال لیں گے"۔

ایک روز محافظوں نے سب قیدیوں کو باہر کھلے میں جمع کیا' بیماروں اور زخمیوں سے بھی کوئی رعائت نہیں برتی گئی' قیدی ایک دوسرے کے سہارے اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے لشٹم پشٹم کھلے میدان میں پہنچ گئے' کوئی تین ہزار کے لگ بھگ قیدی کچن کی بلڈنگ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ بھیڑ بکریوں کی طرح جمع کر دیئے گئے اس تنگ جگہ پر جھلساتی ہوئی دھوپ اور شدید گرمی میں وہ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے کھڑے تھے' سپاہیوں نے فائر کرنے کے انداز میں پوزیشنیں سنبھال لیں' ایک سپاہی جو ہمہ وقت اپنی مشین گن کے ساتھ خطرناک انداز میں کھیلتا رہتا تھا چھت پر چڑھ گیا اور اس نے مشین گن کو لوڈ کرنا شروع کر دیا' گولیاں بھرنے کے بعد اس نے زمین پر لیٹ کر گن کا رخ قیدیوں کی طرف کیا اور شست باندھ لی۔

جیمو نے ایری کو زور سے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے سر پر اپنے بازوؤں کی اوٹ کر دی تاکہ وہ اپنے اردگرد ہونے والی یہ خوفناک کارروائی نہ

دیکھ سکے' تین بکتر بند ٹرک جن پر لگی توپوں کے منہ قیدیوں کے اس ہجوم کی طرف تھے ان سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئے۔

"یہ ہم سب کو ختم کرنے والے ہیں"۔ کسی نے کہا

ہر کوئی خوف زدہ تھا ان کے چہرے زرد اور آنکھیں دہشت سے بھری تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کی اندرونی مزاحمت بھی تھی کہ وہ سب خاموشی سے اپنی طرف تانی ہوئی بندوقوں کو گھورتے چلے جا رہے تھے۔ تقریباً" ایک گھنٹے تک دونوں فریق اسی حالت میں رہے پھر قیدیوں کو واپس بھیج دیا گیا۔

تمام گارڈ اردگرد کے گاؤں امارسکا' مریکا اور گرینڈینا سے تعلق رکھنے والے نوجوان تھے' ان سرب رضاکاروں میں کوئی باقاعدہ فوجی نہیں تھا' ہفتے کی شام کو بنجالوکا سے تربیت یافتہ فوجی کیمپ میں آتے جنہیں یہ رضاکار لوگ "ماہرین" کے نام سے پکارتے تھے یہ لوگ واقعی اپنے فن' یعنی ہاتھ پاؤں اور جسم کے دوسرے اعضاء توڑنے کے ماہر تھے۔ سروں کو دیوار سے مار کر کھوپڑیاں توڑنا بھی ان کا ایک فن تھا۔ ہفتہ وار چھٹیوں کے دوران امارسکا کیمپ میں خون کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک دن ایسا ہی ایک ماہر فوجی کھلے میں کھڑے قیدیوں کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے بلند آواز سے کہتا جا رہا تھا۔

"آج میری پچیسویں سالگرہ ہے اور میں نے ابھی تک صرف تیئس مسلمان ہلاک کئے ہیں!" یہ کھلی جگہ وہ آنگن نما مخصوص علاقہ تھا جہاں قیدیوں کو کھانے کے بعد لے جایا جاتا تھا' کھانے سے فارغ ہونے والے قیدیوں کے ہر گروپ میں سے کچھ لوگوں کو عمارت کی طرف پشت کر کے زمین پر بٹھایا جاتا تھا جب دوسری قید گاہوں سے نئے قیدی تفتیش کی غرض

سے مخصوص کمروں میں لے جائے جاتے تو زمین پر بیٹھے ہوئے تمام قیدیوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ منہ کے بل لیٹ کر سروں کو اپنے بازوؤں کے اندر کر لیں تاکہ وہ اردگرد ہونے والی کسی کارروائی کو نہ دیکھ سکیں۔ یہ وہ وقت تھا جب گارڈز "نافرمان" قیدیوں کو "سیدھا" کرتے تھے۔ ایک پیلے رنگ کی وین ان کے کٹے پھٹے اور بعض اوقات مردہ جسموں کو بھر کر کسی نامعلوم منزل کی طرف چلی جاتی تھی۔ عام طور پر لاشیں لادنے کا کام قیدیوں سے لیا جاتا تھا جنہیں بعد میں خود بھی لاشوں کی شکل میں اسی گاڑی میں لاد دیا جاتا تاکہ کوئی چشم دید شہادت باقی نہ رہے۔ جب گارڈ اپنی کارکردگی دکھانے کے موڈ میں ہوتے تو قیدیوں کو تیز جھلساتی ہوئی دھوپ میں چربی جلاتے ہوئے ننگے فرش پر پیٹ کے بل لیٹنے کا حکم دے دیتے' یہ عمل تقریباً" دس گھنٹے کا ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا موڈ روزانہ ہی اس طرح کا ہوتا تھا۔

شاذو نادر ہی ایسا ہوتا کہ قیدیوں کو اس کھلی جگہ پر گھومنے پھرنے یا اپنی مرضی سے کسی جگہ پر بیٹھنے کی اجازت ملتی لیکن یہ سب کچھ پہریداروں کی انتہائی کڑی نگرانی میں ہوتا' ایک بار یوں ہوا کہ قیدیوں نے محافظوں کی فیاضی پر زیادہ ہی بھروسہ کرلیا۔ رزو ہڈزالک' ایک تیس سالہ شخص جیمو کے گروپ میں آن بیٹھا وہ وہاں بیٹھا روٹی کا وہ ٹکڑا کھا رہا تھا جسے وہ محافظوں کی ڈالی ہوئی جلدی کے باعث کنٹین پر ختم نہ کر سکا تھا' ایک محافظ نے قریب سے گذرتے ہوئے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ "ہیلو" کہا۔ ایک لمحے کو رزو کو وہ سپاہی ایک ہمدرد اور شریف آدمی لگا چنانچہ اس نے اپنی مخصوص بوسنین گرمجوشی کے ساتھ اسے جواب میں "ہجرم" کہا جس کا مطلب ہے "شکریہ"

تمہارا خیال ہے تم مجھے برابر کی سطح پر "شکریہ" کہہ سکتے ہو۔ سپاہی نے اسے ماں کی گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اب میں تمہیں اگلے جہان بھیج کر ہی چھوڑوں گا"۔

وہ "نیک دل" انسان پلک جھپکنے میں ایک وحشی درندے کی شکل اختیار کر گیا اس نے رزو کو پکڑا اور پھر اسے بری طرح ڈنڈے سے مارتا ہوا اوپر لے گیا' چند منٹ بعد اس نے دو قیدیوں کو اوپر بلایا اور رزو کے زخموں سے چور بدن کو نیچے لے جانے کے حکم کے ساتھ باقی قیدیوں کو پیٹ کے بل لیٹ جانے کا حکم دیا' رزو کی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں مگر اس کی مدد کرنا تو کجا کسی کو اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی ہمت نہ ہو سکی آہستہ آہستہ رزو کی سسکیاں تھمنے لگیں۔

"اس غلاظت کے ڈھیر کو اندر لے جاؤ" ایک گارڈ چلایا۔

جب قیدی اپنے زندان میں جانے کے لئے اٹھے تو رزو کی لاش وہیں پڑی رہ گئی۔

بعد میں جب رزو کی بیوی کیمپ میں آئی تو کسی نے اسے اصل واقعہ نہ بتایا۔ قاتل سپاہیوں میں تمام تر خباثت کے باوجود اتنی جرات نہ تھی کہ اس کے سامنے اس کے شوہر کے وحشیانہ قتل کا اعتراف کرتے؛ نہ ہی ان کے پاس اس کے لئے کوئی دلیل تھی لیکن ان کا ہر ہر انداز ان کی قاتلانہ خصلت کا آئینہ دار تھا۔ رزو ایک امن پسند انسان' ایک مثالی شہری اور ایک انتہائی عمدہ باپ تھا' اس کے بچوں کو جو پربیجڈور میں ہی تھے۔ بہت دنوں تک اس کے مرنے کی اطلاع نہ مل سکی۔ اس کی بیوی ہتھیلیوں پر ٹھوڑی جمائے رزو کی مخصوص کرسی پر بیٹھی ہر روز باہر کی طرف دیکھتی رہتی جیسے وہاں وہ کچھ ڈھونڈ

رہی ہو اس کی آنکھوں میں ایک ایسا شک اور بے یقینی تھی جیسے اسے ہونی کا علم ہو چکا ہو۔

جو زندانی ابھی تک ان پہرے پر مامور درندوں کے ہاتھوں موت کا لقمہ نہیں بنے تھے ان کی روحیں بھی کم زخمی نہ تھیں۔ تقدیر ان پر مسلسل نامہربان تھی' ان کے جسم دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے مردے قبروں سے نکل آئے ہوں جیسے زمین ایک زور دار دھماکے سے ان کے زندان کی چھت کے شہتیروں سے آ ٹکرائی ہو اور سب کچھ تباہ ہو چکا ہو۔ مسلسل مار پیٹ' گالیاں اور بے حرمتی ان کا مقدر بن چکی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے نیکی کی آخری رمق بھی وہاں سے اٹھ گئی ہو۔

سرب جیلر' اپنے ہی کئے ہوئے وعدوں کو اپنے فوجی بوٹوں سے روندتے اور خنجروں سے کاٹتے جا رہے تھے جس سے نہ ان کو کوئی فائدہ پہنچ رہا تھا اور نہ ان کے قبیلے کو۔ یہ ایک عجیب اور بے معنی کھیل تھا جو ان کا طرز حیات بنتا جا رہا تھا اور جس کے چکر میں قیدی اپنی جان سے جا رہے تھے' کوئی بھی صحیح الدماغ شخص اس صورت حال کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کہ ایسے مخدوش کھیل کا انجام بخیر نہیں ہو سکتا۔

اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس زہریلے کھیل کا خیال سب سے پہلے کس کے دماغ میں آیا تھا؟ کیا اس خون آشام گیت کار سراجیوو کے اس باؤلے نفسیات دان راڈوون کارڈزک کے سر میں! جس نے برسوں پہلے اس آنے والی ابتلائے عظیم کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ

"رحم کو نزدیک مت آنے دو' آؤ چلیں
اور شہر کو ان ناپاک اور غلیظ لوگوں سے پاک کر دیں'

اسی نے اس جعلی اور پر فریب حکومت کی بنیاد رکھی تھی جو بلغراد میں موجود ظالم طاقتوں کی آلہ کار تھی۔ اسی نے سربوں کے دلوں کی تہوں میں چھپی ہوئی نفرت کو آشکار کیا تھا اور انہیں ایک منہ زور' وحشی اور انسان کش بہیمیت میں مبتلا کر دیا تھا' کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب وہ کبھی اس بربریت کے نشے سے نکل کر انسانیت کے جامے میں واپس آ سکیں گے۔

مسلسل تحقیر کے شکار اور اپنی مرضی کے خلاف پکڑے گئے ان قیدیوں کے چٹختے ہوئے ہونٹوں سے مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی تھی' پست ہمتی' بیماری اور موت کی حد کو چھوتی ہوئی فاقہ کشی کے باعث ان کی نم آلود آنکھیں خلاء میں بے مقصد گھورتی رہتی تھیں' اپنے گرفتار کنندگان کی طرح وہ بھی اسی زمین کے بیٹے تھے' اسی آسمان تلے پیدا ہوئے تھے اور یہیں انہوں نے اپنی زندگیوں کے شب و روز گزارے تھے' بزرگ شاعرہ نے کہا تھا۔

"بلقان کی پہاڑیوں میں آباد اس کسانوں کی سرزمین میں ہم سب ایک دوسرے کے سنگی ساتھی ہیں"

ان بدنصیب قیدیوں کو تو اب یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ کس ملک کے باشندے ہیں! وہ سب اسے "بوسنیا ہرزیگووینا" کے نام سے جانتے تھے مگر انہیں قید کرنے والے اسے "سرب جمہوریہ" کا نام دیتے تھے' قیدیوں کو اس نئے نام پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا اگر وہ اس "جمہوریہ" میں مسلمان' کروشیائی اور یہاں کے باقی رہنے والوں کو بھی شامل کر لیتے جو صدیوں سے اس علاقے میں انہی سربوں کے ساتھ مل جل کر رہتے چلے آ رہے تھے۔

مقامی بزرگ شاعرہ کی نظم کا مصرعہ کہ "بلقان کی پہاڑیوں میں آباد اس

کسانوں کی سرزمین میں ہم سب ایک دوسرے کے سنگی ساتھی ہیں" ایک سوالیہ نشان بن چکا تھا۔

بے شک یہ کسانوں اور جفاکش پہاڑی لوگوں کی سرزمین تھی' ایک ایسی زمین جس کی فضا ہاتھ سے بنے ہوئے جوتوں اور تازہ ہل پھری ہوئی زمین سے اٹھنے والی مخصوص مہک سے بھرپور تھی!

یہ چمکتے ہوئے جوتوں' سیخ کباب' زیتون کے تیل اور ایڈریاٹک سمندر کے ساحل پر برہنہ جسموں کو زردی مائل کرنے والی دھوپ اور اسی کام کے لئے استعمال ہونے والے لوشن کی زمین تھی!

یہ بے مثال رومانی گیتوں کی زمین تھی۔ جو ایک منحوس اور تلخ پیش گوئی کے عذاب میں مبتلا تھی۔

اے مرے پیارے' حسین اور نرم خو بوسنیا! اے میری پیاری زمین۔۔۔۔!!

میرے ضائع شدہ اور برباد حسن!!

چوتھا باب

بدھ دس جون کی شام' جب تفتیشی عملہ اپنا کام ختم کر کے حسب معمول اپنی مخصوص گاڑی پر پر ہیڈور کے لئے واپس روانہ ہو چکا تھا' ایک گارڈ نے جو معمول سے زیادہ نشے میں تھا اپنا بے ہنگم سر زندان کے دروازے سے اندر کیا اور جیمو کو باہر آنے کے لئے کہا۔

یک دم وہی موت کی گونج آمیز خاموشی' جو رات گئے ایسی طلبی پر اترا کرتی تھی' سارے میں پھیل گئی' جیمو نے اپنے سر میں ایک بگولا سا چکراتا ہوا محسوس کیا جیسے ایک دم سینکڑوں ہتھوڑے اس کی کنپٹیوں کھوپڑی اور گدی پر ضربیں لگانے لگے دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی اور اس کا سارا جسم اس آواز سے گونجنے لگا' اس کے چہرے کی رگیں نمایاں ہو گئیں' اس نے ٹوٹتے ہوئے جملوں میں اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔

"گھبراؤ نہیں بیٹا! مجھے کچھ نہیں ہو گا"۔

جیمو نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا' ایری کے نازک اور کانپتے ہوئے بدن کی لرزش اس کے مساموں میں اترتی جا رہی تھی۔

"ایری میرے بیٹے' حوصلہ رکھو' ڈیڈی ضرور واپس آئے گا"

اس نے بڑی مشکلوں سے ایری کے بازو اپنے کندھوں سے ہٹائے اور منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ ایری اس کے چہرے پر گرتے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکے اور خود اپنے لفظوں کی صداقت پر یقین نہ کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف چلنے لگا' وہ اپنے سر کے پچھلے حصے پر ان دکھی آنکھوں کا وزن محسوس کر سکتا تھا جن کی خاموشی گفتار پر بھاری تھی۔ جہاں سے وہ کچھ

لمحے قبل اٹھا تھا وہاں سے کراہوں اور طویل سسکیوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور آہستہ آہستہ بلند تر ہونے لگیں' ایری بری طرح رو رہا تھا اور ان کمزور بازوؤں کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا جو اسے روکنے کے لئے بڑھے تھے۔

"ڈیڈی۔ ڈیڈی' پلیز مت جاؤ واپس آ جاؤ۔ پلیز"

جیمو ایک لمحے کے لئے رکا اس کی آنکھیں ایری کی آواز کے تعاقب میں اس کی طرف مڑیں۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے حلق میں کوئی بہت بڑا وزنی گولہ پھنس گیا ہو جس کی وجہ سے اسے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اس کے رخساروں پر گرتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے بارش کی صورت اختیار کر گئے' تقدیر کے اس بھیانک مذاق سے نظریں چرانے کی کوشش میں اس نے بمشکل کہا۔

"میں واپس آؤں گا بیٹے .... آؤں گا میں!"

اس کے بعد وہ آگے بڑھا اور گارڈ کے اس باریش اور ظالمانہ سرخوشی سے بھری ہوئی مسکراہٹ والے چہرے کو پیچھے چھوڑتا ہوا باہر نکل گیا جس کی آنکھوں میں سوائے تاریکی کے کچھ نہ تھا۔

"میرے آگے آگے چلو" گارڈ نے وائٹ ہاؤس کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سارا رستہ وہ طرح طرح کی مغلظات بکتا رہا اور گاہے گاہے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کے ساتھ جیمو کے سر کے عقبی حصے پر ضربیں بھی لگاتا گیا' گرم اور حبس زدہ ہوا نے اذیت کے تاثر میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ جیمو نے تقریباً" رک کر اپنے پیچھے پھیلے ہوئے فاصلے پر ایک غیر متعلق سی نظر

دو ڑائی' گارڈ نے اس کی کمر پر رکھی بندوق کی نالی کو اس بے دردی سے اس کے بدن میں چبھویا کہ تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں اس کا سارا چہرہ پسینے سے بھر گیا۔

کچھ دیر کے لئے جیمو کے دل و دماغ میں آگ سی بھڑک اٹھی' قریب تھا کہ وہ مڑ کر اس گارڈ کے داڑھی والے خبیث چہرے پر زور سے تھوک دیتا اور ایک زور دار مکا اس کی نشے میں بدمست تھوتھنی پر جڑ دیتا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا اس کے بیٹے کی دلخراش آواز اس کے کانوں میں ایسے گونجی جیسے اس کے دل کے زخم کا کوئی ٹانکا تڑاخ سے ادھڑ گیا ہو۔ اس نے پرعزم انداز میں اپنا سر اٹھایا اور اعتماد کے ساتھ چلنے لگا' گارڈ اس کو وائٹ ہاؤس کے بائیں طرف واقع دو نمبر کمرے میں لے گیا (اس وقت وائٹ ہاؤس بالکل خالی پڑا تھا قیدی وہاں بعد میں لائے گئے تھے) اگلے ہی لمحے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر آسمان سے کوئی بہت ہی وزنی چیز گری ہو وہ اس ضرب کی شدت سے چکرا کر زمین پر گر گیا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جھماکا سا ہوا اور اس کے بعد ہر چیز دھند لا گئی اس نے نیم ہوش کے عالم میں اپنی آنکھیں کھولنے کی ناکام کوشش کی اس عالم میں بھی اسے احساس تھا کہ اسے زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرنی ہے' اس نے اپنے چہرے اور ماتھے سے خون صاف کیا اور سر اٹھا کر دیکھا۔ چار نشے میں بدمست انسان نما شیطان اپنی آنکھوں میں شدید نفرت اور ہاتھوں میں ڈنڈے لئے بھیڑیوں کے غول کی طرح اس پر جھپٹنے کو تیار تھے' ان خون کے پیاسوں میں ان کا سردار بدنام زمانہ زیجک المعروف زیگا بھی تھا جس کی روح (اگر وہ واقعی موجود تھی!) خون کے دھبوں سے بھری پڑی تھی۔

کہا جاتا تھا کہ وہ اب تک دو سو انسان (جن میں بچے بھی شامل تھے) پر یجیڈور کو "پاک" کرنے کے نام پر قتل کر چکا تھا موت بانٹنے کا یہ شغل اس کو اتنا پسند تھا کہ بعض اوقات اسے دو قتلوں کے درمیان اپنا خون آلود چاقو واپس نیام میں رکھنے کا موقعہ بھی نہیں ملتا تھا وہ ایک لمبی ٹانگوں والا دبلا پتلا انسان تھا جس کے چہرے پر ایک بہت بڑے مندمل زخم کا نشان تھا وہ ایک ایسے داستانوی شیطان کی طرح تھا جو اپنی تمام سفاکی اور شقاوت سمیت آج کے زمانے میں چلا آیا ہو' زیگا کے قریب آنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں موت کے قریب آنا تھا۔

"اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ زیگا کا طریقہء کار کیا ہے" اس نے جیمو کو پانی گرم کرنے والے "بھاپ گھر" کے قریب گھٹنوں کے بل جھکنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک وحشیانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا

"کتے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر ہو جاؤ"

جیمو نے ایک نومولود بچے کی سی بے بسی اور ذلت کے شدید احساس کے ساتھ اس کے حکم کی تعمیل کی۔

عین اسی وقت وہ اس کے زندان سے آصف' کیکی اور بیجو کو لے آئے' بیجو سب سے آخر میں تھا۔ قاتلوں کے گروہ کا سب سے کم عمر رکن نکسیکا اس کو دھکے دیتا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی ادھر سے مارنے پیٹنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ آصف کو بھی جیمو ہی کی پوزیشن میں بھاپ گھر کے دوسری طرف کھڑا کر دیا گیا۔

سب سے طویل قامت گارڈ ڈوکا نے جو ایک اور قاتل صفت مقامی تھا'

کیکی کو کمرے کے عین وسط میں کمر کے بل لیٹنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ ہوا میں اچھلا اور اپنے 250 پونڈ وزنی جثے کے ساتھ کیکی کے پیٹ اور پسلیوں پر اس قدر زور سے گرا کہ پسلیاں ٹوٹنے کی آواز سارے کمرے میں پھیل گئی ایک اور وحشی نے جس نے سر پر ایک فیتہ سا باندھ رکھا تھا بجلی کی موٹی تاروں سے بنائے گئے ایک ڈنڈے سے آصف کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا' زیگا نے جیمو کے سر اور کمر پر ایک ایسے ڈنڈے سے ضربیں لگانے کا عمل مسلسل جاری رکھا جس کے ایک سرے پر لپٹا ہوا دھات کا ایک ایسا گولا تھا جو ضرب لگاتے وقت کھل جاتا تھا' جیمو ضرب کی شدت کو کم کرنے کے لئے اپنے سر کو کندھوں کے اندر دبا کر گچھا مچھا سا ہو جاتا اور زیادہ چوٹیں اپنے باہر نکلے ہوئے داہنے ہاتھ پر برداشت کرتا' زیگا کی آنکھوں میں نفرت کا الاؤ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا اور وہ مسلسل گندی گندی گالیاں بک رہا تھا' جیمو کے سر سے ٹپکنے والے خون کے قطرے فرش کی ٹائلوں پر آہستہ آہستہ بڑھنے لگے اور تھوڑی دیر میں وہاں گہرے سرخ رنگ کا ایک تالاب سا بن گیا' زیگا کبھی کبھی اپنے اس وحشیانہ عمل سے تھک کر چند لمحوں کے لئے سانس بحال کرنے کی خاطر پیچھے ہٹتا' اپنی قمیض کے دامن سے اپنے مسخ شدہ چہرے کو ہوا دیتا اور دوبارہ زدوکوب میں مصروف ہو جاتا۔

نجانے کس وقت ایک وردی پوش آدمی دروازے میں آکر کھڑا ہوا' یہ ساپونجا تھا جو پریجیڈور کا مشہور فٹ بالر تھا اور ایک وقت میں اس کی جیمو سے خاصی صاحب سلامت رہی تھی وہ جیمو کے پاس آیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

"ہاں تو میرے پرانے عزیز دوست جیمو ---- جب میں پیکرک اور لی

پک کے محاذوں پر مصروف جنگ تھا تم یہاں پر بیڈور میں مزے کر رہے تھے۔"

اس نے عین جیمو کے منہ پر ایک زور دار ٹھڈا مارا اور پھر اپنے بھاری فوجی بوٹوں کے ساتھ پے درپے جیمو کے سینے پر اس قدر زور دار ٹھوکریں ماریں کہ اسے اپنی پسلیاں ٹکڑے ہوتی محسوس ہوئیں۔ جیمو نے گرنے سے بچنے کی خاطر بہ صد مشکل اپنی ٹانگوں اور بازوؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک بار وہ گر گیا تو اس کے بعد دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا۔ زیگا ایک جنونی کی طرح ہنسا اس نے بازو سے پکڑ کر ساپونجا کو ایک طرف کیا اور پھر اپنے مخصوص ڈنڈے سے جیمو کو روئی کی طرح دھنکنے لگا۔

کمرے میں پھیلی ہوئی خون اور پسینے کی بو اور دبی دبی سسکیوں کی آوازیں ان جانوروں کے جوش جنوں کو اور مہمیز کر رہی تھیں۔ جیمو کے چہرے پر اس بار جو ضرب لگی وہ پہلے سے بھی زیادہ شدید تھی وہ درد سے دوہرا ہو کر ایک طرف کو جھکا اور پھر زمین پر گر گیا۔ اس کا سر اپنے ہی بہے ہوئے لہو میں ڈوب سا گیا جس کا حجم اب پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا' زیگا نے اسے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اس کے تقریباً مسخ شدہ چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے چلایا'

"اٹھو غلیظ کتے اور دفع ہو جاؤ یہاں سے ..... سب دور ہو جاؤ میری نظروں سے"

زیگا نے اسے گدی سے پکڑ کر پاؤں پر کھڑا کیا' جیمو کے لئے توازن برقرار رکھنا بے حد مشکل ہو رہا تھا مگر اس نے کسی نہ کسی طرح دروازے کی

طرف پہلا اور پھر دوسرا قدم بڑھایا' آصف اور کیکی نے اس کی تقلید کی۔

"کتوں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں پر ہو جاؤ" زیگا کسی سفاک آمر کی طرح غرایا

اس کے حکم پر تینوں آدمی زمین پر رینگتے ہوتے وائٹ ہاؤس کے قریب جمع شدہ کیچڑ میں سے گذرے جس کے بعد انہیں غلیظ اور متعفن پانی سے نہانے کا حکم دیا گیا انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے اپنے چہروں پر جمع ہوئے خون کو صاف کیا۔

"لگتا ہے ان لڑکوں نے بہت زیادہ سٹرا بیریاں کھالی ہیں! دیکھو ان کے چہرے کیسے سرخ ہو رہے ہیں!

اپنے اس مذاق پر زیگا دیر تک مجنونانہ انداز میں ہنستا رہا اور پھر انہیں ہنکاتا ہوا واپس وائٹ ہاؤس میں لے گیا جہاں سلاوکو ایکیمووچ نامی ایک کروشیائی اسی اذیت خانے میں لایا گیا تھا جہاں سے کچھ دیر پہلے وہ خود مار کھا کر نکلے تھے' یہ شخص ان چند لوگوں میں سے تھا جنہوں نے سب سے پہلے مقامی سرب حکومت کے خلاف نعرہ ء احتجاج بلند کیا تھا' اس کا چہرہ تقریباً" ناقابل شناخت ہو چکا تھا' وہ بھاپ دان کے پاس گھٹنوں کے بل گٹھڑی بنا پڑا تھا' اس نے سر اٹھایا تو جیمو نے دیکھا کہ اس کے چہرے کی جگہ خون کے لوتھڑوں کا ایک گچھا سا تھا کیونکہ اس کے چہرے کی ساری جلد کاٹ کر چھیل دی گئی تھی اور آنکھوں کی جگہ جمے ہوئے سیاہی مائل خون سے بھرے ہوئے دو گڑھے سے بن چکے تھے۔

"تم سب اور تمہارے خاندان اسی طرح ختم کر دیئے جائیں گے" زیگا نے ایک فوجی کمانڈر کی طرح اعلان کیا۔

ہم نے اس کی ماں باپ اور بہنوں کو ختم کیا' اب اس کے بچوں کی باری ہے اور تمہارے بچوں کو بھی ہم سب کو باری باری ختم کر دیں گے" یہ کہتے ہوئے اس نے جیمو کے چہرے پر پوری قوت سے گھما کر ٹھوکر ماری۔

جیمو نے اپنے منہ اور ناک سے جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں کو ٹکڑوں کی صورت میں اڑتے ہوئے دیکھا اور ٹوٹے ہوئے دانتوں کے ٹکڑے اس کی زبان میں دھنستے چلے گئے۔ اس کے بعد یکدم سناٹا ہو گیا اور ہر چیز رک گئی۔

ٹھوکریں' گالیاں حتیٰ کہ سسکیاں تک ٹھہر سی گئیں۔ جیمو کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے چاروں طرف پھیلی ہوئی دھند میں سے کسی باوردی شخص کا ہیولا' کمرے میں داخل ہوا اس کے آتے ہی جیسے کسی خاموش حکم نامے کے ذریعے مار پیٹ رک گئی' قیدیوں کو اسی جوہڑ کے پانی سے منہ ہاتھ صاف کرنے کے بعد ان کے قید خانوں میں واپس بھیج دیا گیا البتہ سلاولو ایکیمیووچ اس کے بعد کبھی نظر نہیں آیا۔

سب سے پہلے جیمو اندر داخل ہوا۔ اس کے دروازہ کھولنے پر اندر سے آتی ہوئی آوازیں اور سرگوشیاں ایک دم رک گئیں اور کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی پھیل گئی اس نے بمشکل اپنا بازو اٹھایا اسے یوں لگا جیسے سامنے کھڑے ہوئے لوگ اسے راستہ دینے کے لئے جگہ بنا رہے ہیں اور پھر ایک تیز چیخ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "ابا"!

جیمو نے بے ہوشی کی بے نام گہرائی میں گرنے سے پہلے اپنے بیٹے کے بازوؤں کو اپنے جسم کے گرد لپٹتے ہوئے محسوس کیا' اسے اپنے ارد گرد ایک خاموشی بھری تاریکی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس دوران کتنا وقت گذرا مگر جب اسے ہوش آنا شروع ہوا تو اس نے اپنے چہرے اور جسم پر ایک نم آلود ٹھنڈک سی محسوس کی اور یوں لگا جیسے بہت دور سے کچھ ناقابل فہم قسم کی آوازیں آ رہی ہوں اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو درد کی ایک تیز لہر اس کے سر میں جیسے کوند سی گئی' اس کے جسم اور چہرے پر گرم اور ٹھنڈی پٹیوں سے مساج کیا جا رہا تھا' آہستہ آہستہ جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اردگرد کھڑے لوگوں کے ہجوم میں سب سے پہلے اس نے جو چیز پہچانی وہ اس کے بیٹے کا آنسوؤں بھرا چہرہ تھا۔

اسے بحال ہونے میں بیس دن لگے۔ شروع کے چند دنوں میں تو وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا اس کا بیٹا ایری چند دوسرے لوگوں کے مدد اسے غسل خانے تک لے جایا کرتا تھا۔ جیمو کو اپنی یہ بے چارگی اور معذوری اچھی نہیں لگتی تھی کہ وہ ہر کام کے لئے دوسروں کی مدد کا محتاج ہو مگر اس کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ وہ کھانے کے لئے کنٹین تک بھی نہ جا سکتا تھا چنانچہ اس کے ساتھی اس کے لئے اپنے راشن میں سے روٹی کے کچھ ٹکڑے بچا کر لے آتے۔ کبھی کبھی کوئی بسکٹ بھی ہاتھ لگ جاتا۔ ایری روزانہ اپنے کھانے کا نصف حصہ اس کے لئے بچا کر لے آتا تھا۔

جب اس نے پہلی بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو وہ چیخ اٹھا' اس کا چہرہ مندمل زخموں اور اندرونی چوٹوں کے باعث سیاہی مائل نیلوں سے بھر چکا تھا' اس کی ناک کی جگہ اب ایک سوجے ہوئے گوشت کا گومڑا سا تھا جس کے پھیلاؤ کی وجہ سے اس کی آنکھیں تقریباً" چھپ گئی تھیں' سامنے کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور اس کی کمر مسلسل پڑنے والی ضربوں کی وجہ سے اپنا

رنگ تبدیل کر چکی تھی' چوٹوں کے نیل پھیل کر ایک گہری سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکے تھے' ڈاکٹر صادقووچ نے بعد میں اسے بتایا کہ اس کی ناک ایک پسلی اور دائیں ہاتھ کی کلائی ٹوٹ چکی تھی مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے کہا۔

"سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم اس تشدد کو سہار گئے ہو' ہم سب سمجھتے تھے کہ تم ایسا نہیں کر سکو گے سو اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ایک مضبوط آدمی ہو"۔

ڈاکٹر نے زندان کے دروازے سے لکڑی کے ٹکڑے اتار کر ان سے کھپچیاں بنائیں اور پھر جیمو کی قمیض کو پھاڑ کر اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کی مرمت کے لئے اس کی پٹیاں بنا کر مرہم پٹی کر دی۔

آصف کو اس کے بعد دو مرتبہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا' دوسری مار کے بعد وہ سیدھا لیٹنے کے قابل نہ رہا کئی دنوں تک وہ مسلسل ایک کرسی میں بیٹھا رہا' اسی عالم میں وہ اپنے بازو کرسی کے ایک ڈنڈے پر رکھ کر ذرا سا آگے کو جھک جاتا یہ اس کے سونے کی صورت حال تھی۔ ٹوائلٹ میں بھی اسے کرسی سمیت اٹھا کر لے جایا جاتا جب وہ ذرا سا بہتر ہوا تو گارڈوں نے اسے تیسری بار باہر طلب کیا اور یہ اس کی آخری پیشی تھی۔

کیکی کو بھی دو بار اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا' اس نے دو بار خودکشی کی ناکام کوشش بھی کی۔ ایک بار اس نے دھات کے ایک تیز دھار ٹکڑے سے اپنی رگیں کاٹنے کی کوشش کی اور دوسری بار محافظوں نے اس کے گلے سے تار کا وہ ٹکڑا بروقت علیحدہ کر دیا جس کو وہ غسل خانے کے دروازے کی بالائی مضبوط پٹی سے باندھ کر پھانسی کا پھندا بنا رہا تھا' یہ تار غلاظت کو باہر نکالنے والے

پائپوں کی صفائی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو اکثر بند رہتے تھے جس کی وجہ سے غلاظت کی تیز اور انتہائی ناگوار سڑانڈ ہمہ وقت اردگرد کے سارے ماحول کو ناقابل برداشت بنائے رکھتی تھی۔

بیگو کو نکسیکا نامی ایک مقامی شیخی خورے امیرزادے نے تین بار تشدد کا نشانہ بنایا آخری مرتبہ جانے سے قبل اس نے بیگو کو مخاطب کر کے کہا۔

"اس بار میں تمہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں لیکن میری ماں نے تمہاری جان بخشی کی اپیل کی ہے اس نے بتایا ہے کہ تم بچوں والے ہو۔ بس یوں سمجھو کہ میری ماں کی وجہ سے تم بچ گئے ہو"

اس کے کچھ دن بعد بیگو کو وہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا اور پھر ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔

زیگا اور اس کے لفنگے ساتھی امارسکا کیمپ پر "متعین" بھی نہیں تھے' ان کا تعلق "کیراترم" کے عقوبت خانے سے تھا انہیں امارسکا کیمپ میں خصوصی طور پر بلایا جاتا تھا کیونکہ وہ تشدد کے فن میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے' یوں بھی یہ کیمپ ان تمام سرب رضاکاروں کے لئے کھلا تھا جن کا کوئی مطلوبہ آدمی وہاں پایا جاتا ہو' کوئی ایسا بدنصیب قیدی جس سے وہ اپنا کوئی پرانا حساب صاف کرنا چاہتے ہوں۔ عام طور پر ایسے لوگ ان کے سابقہ قریبی ہمسائے ہی ہوتے تھے جنہیں کوئی نہ کوئی بہانہ ڈال کر وہ شدید تشدد کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔

تاریخ کو مسخ کرنے والے ان درندوں کے اپنے چہرے بھی مسخ ہو چکے تھے' ان کی وحشت بھری قاتل آنکھیں' ان کے کمر کے ساتھ بندھے ہوئے

خنجروں سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے شکاروں کے وجود کو چیرتی تھیں اور وہ انہیں اذیت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے' ان میں سے زیادہ نمایاں علاقے کے چھوٹے موٹے بدمعاش اور معمولی لفنگے تھے جو اپنی طاقت اور جوان مردی دکھانے کے لئے ہمہ وقت بے تاب رہتے تھے' راتوں رات یہ لوگ اپنے ہمسایوں کے ازلی دشمنوں کی شکل اختیار کر گئے۔ یہ بات عام تھی کہ آپ کسی بھی سرب سپاہی کو پچاس ڈالر دے کر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اپنے "مجوزہ" قیدی کا نام لکھ دیں۔ اس قیدی پر اگلی صبح کبھی طلوع نہیں ہو گی۔

زیگا کے لگائے ہوئے زخموں کے وقفہء اندمال کی درمیان بوسانکا کوسٹا جنیکا کے ایک حاجی نے جیمو کی بہت مدد کی۔ حاجی رمیز جیمو کے بالکل قریب سوتا تھا اور اس نے دونوں کے مشترکہ کمبل کا اپنے والا حصہ بھی جیمو کو دے دیا تھا اور خود چمڑے کی ایک بوسیدہ اور پھٹی پرانی جیکٹ کو بطور بستر اور کمبل کے استعمال کرتا تھا حالانکہ حاجی رمیز خود بہت سخت بیمار تھا' چند ماہ قبل ایک کار کے حادثے میں اس کی کئی ایک پسلیاں اور دائیں ٹانگ بہت سے جگہوں سے ٹوٹ چکی تھی۔ پر یجیڈور کے ہسپتال میں علاج کے بعد جب وہ اپنے گھر آیا تو کچھ ہی دن بعد اسے راہ چلتے پکڑ کر امارسکا کیمپ میں لے آیا گیا' اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں لوہے کا راڈ ڈال دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ اب قدرے لنگڑا کر چلتا تھا۔ اس نے جیمو کو بتایا "جب تم گھر جاؤ تو جاتے ہی ایک بھیڑ کی تازہ کھال لینا اور اسے اپنی زخمی کمر پر چند دن لپیٹے رکھنا اس طرح کی چوٹوں سے صحت یابی کا یہی بہترین طریقہ ہے"۔

بارشوں کے دنوں میں وہ اکثر کہا کرتا'

"یہ اللہ کا فیصلہ ہے' بارش زمین پر بکھرے ہوئے لہو کے تمام نشانوں کو بہا لے جائے گی اور اس وقت تک نہیں رکے گی جب تک ساری لاشیں ٹھکانے نہیں لگ جاتیں"۔

جیمو کی گرفتاری کے دو ماہ بعد ایک دن اچانک سربوں نے 65 سال سے زیادہ اور 18 سال سے کم عمر کے قیدیوں کو رہا کر دیا چنانچہ حاجی رمیز کو بھی آزادی مل گئی جیمو کے لئے یہ ایک انتہائی خوشی کا دن تھا کیونکہ اس کے بیٹے ایری اور چچازاد فادو کے بیٹے علی جان کا نام بھی آزادی پانے والوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اس دن صبح تمام آزادی پانے والوں کو باہر کھلی جگہ پر جمع کیا گیا' جہاں وہ تیز اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سارا دن بیٹھے رہے شام کے وقت دو بسیں انہیں ترلوپولے کیمپ میں جانے کے لئے آئیں جنہیں سربوں نے "استقبالیہ" کا نام دے رکھا تھا۔

یہاں سے ان کو وقفے وقفے سے ان کے گھروں میں پہنچا دیا گیا' ایری کو گھر جانے کے لئے (17) سترہ دن تک ترلوپولے کیمپ میں انتظار کرنا پڑا۔

پانچواں باب

ہر صبح قیدیوں کی آنکھ ایک اضطراب اور دہشت کی فضا میں کھلتی اور دور دور تک کہیں اس ظلم کے خاتمے کا ہلکا سا اشارہ بھی نظر نہ آتا تھا جس میں رات کی حاضریاں' روزانہ کی تفتیش' تشدد' مار پیٹ' چیخ و پکار اور کراہیں ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکی تھیں لیکن اب سب سے بڑھ کر جیل کے عملے کا قیدیوں کے دکھ' درد اور تکلیف سے مکمل بے اعتنائی کا رویہ تھا جس کی اذیت ناقابل بیان تھی۔

قیدیوں کے جسم گندے اور جوؤں سے بھرے تھے اور ان کی چرمرائی ہوئی کھال جیسے ان کے جسموں کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ سب کی پسلیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں' ظلم کی چکی میں پس کر وہ سب ایک جیسے ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی شکلیں بھی آپس میں ملنا شروع ہو گئی تھیں' شدید نقاہت کی وجہ سے ان کی حالت مردوں جیسی ہو رہی تھی' ایک ناقابل برداشت سڑانڈ نتھنوں کے راستے ان کے جسم میں داخل ہوتی رہتی جس کا لجلجا اور کراہت آمیز ذائقہ ہمہ وقت ان کے منہ میں رہتا تھا' محافظ گاہے بگاہے دروازہ کھولتے تو تمام قیدیوں کا رخ دروازے کی طرف ہو جاتا جیسے تازہ ہوا کے اس جھونکے سے وہ خود کو اپنے سانس لے سکنے کا یقین دلا رہے ہوں دروازے بند ہوتے تو پھر وہی مار پیٹ کا سلسلہ شروع ہو جاتا جس کی کوئی حد نہ تھی' قیدی اپنے آپ کو تازہ اور صاف ہوا کے جھونکے کے لئے دروازے قریب تر رکھنے کی کوشش کرتے حالانکہ اس کے لئے انہیں اپنی پشت پر ڈنڈے یا رائفل کے دستے کی اضافی ضربیں سہنا پڑتی تھیں۔

کئی دنوں تک سیجرک سے تعلق رکھنے والا محمد نامی ایک اکتیس سالہ قیدی دروازے کے پاس پڑا رہا' وہ شوگر کا مریض تھا' اس کے بھائی نے جو جرمنی میں رہتا تھا اس کے لئے بوسنیا کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر دو سال کی انسولین کا سٹاک ایک ساتھ ہی بھجوا دیا تھا' اس کے باپ اور چھوٹے بھائی نے' جو اس کی ساتھ ہی قید تھے' محافظوں کی بہت منتیں کیں کہ کسی طرح اس کی دوائی وہاں منگوا لی جائے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی' محمد آہستہ آہستہ گھلتا گیا' اس کا چہرہ موت کی بڑھتی ہوئی زردی کی وجہ سے عجیب سا ہو گیا اور پھر ایک دن وہ اپنے بھائی کے بازوؤں میں چپ چاپ مر گیا' اس کا سانس ایک دم چلتے چلتے رک گیا اور اس کی کھلی آنکھیں اوپر کی طرف دیکھتی رہ گئیں' جب چار آدمی اس کا مردہ جسم اٹھا کر باہر لے جا رہے تھے۔ تمام لوگ بہت دیر تک سر جھکائے اس کے احترام اور ماتم میں کھڑے رہے ان کی خاموشی ان کی بے عملی اور نامردی کا اظہار کر رہی تھی۔

یہ منظر اسی کے بعد کئی بار اسی طرح دوہرا گیا اور یکے بعد دیگرے صفت راما ڈانووچ' سیمل پیزو' سلجو گینک (جو بیجا کے علاقے کا ایک کروشین) اور جیموورچ مردہ حالت میں باہر لے جائے گئے' انہیں قید خانے کی عمارت کے سامنے والے لان میں لے جایا گیا' جہاں سے ایک پیلے رنگ کی وین انہیں کسی نامعلوم منزل کی طرف لے گئی صرف صفت راماڈانووچ (جو کہ پریجیڈور کے ایک مشہور ریستوران کا مالک تھا) اور سلجو گینک کے رشتہ داروں کو ان کی لاشیں لے جانے کی اجازت دی گئی۔

امارسکا میں موت آسان اور زندگی مشکل تھی' دور دور تک کوئی امید کی کرن دکھائی نہ دیتی تھی' کوزارا پہاڑیوں کے دامن میں بچھے مرغزار میں کم

از کم ان دنوں کی حد تک، ایک بھی گل سرسبز نظر نہ آتا تھا۔

اس حیات کش ماحول میں "ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" کا اصول کار فرما تھا اور صرف انتہائی مضبوط جسموں اور غیر معمولی صحت والے ہی زندہ بچ پائے، جن میں اس زبردست تشدد کو سہہ سکنے کی ہمت تھی یا وہ معدودے چند، جو کسی نہ کسی طرح "طلبی" سے بچ گئے۔ ریاضی کا استاد، عبداللہ پسکر ایک چھ فٹ قامت کا، باکسر نما، مضبوط اور غیر معمولی حد تک صحت مند انسان تھا لیکن اس کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ محافظوں میں اس کا ایک ایسا سابق طالب علم نکل آیا جو سکول کے دنوں میں اپنی نالائقی کے باعث سزا پاتا رہا تھا، جب اس نے پہلی بار عبداللہ کو کنٹین سے واپس آتے ہوئے دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے بڑے طنزیہ انداز میں اپنے سابق استاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ پروفیسر....... کیسی عزت کی بات ہے کہ تم سے یہاں اس ماحول میں ملاقات ہو رہی ہے۔ میں نے تمہارے بہت لیکچر سنے ہیں اب تمہیں بھی میری کچھ باتیں سننا ہوں گی"۔ یہ کہہ کر وہ اسے بالائی منزل میں لے گیا اور انتہائی ہتک آمیز اور گندی زبان میں اسے ٹائلٹ صاف کرنے کا حکم دیا اس کے بعد جب کبھی اس شاگرد کی ڈیوٹی رات کے وقت لگتی، وہ عبداللہ کو باہر بلواتا اور اس پر وحشیانہ تشدد کرتا، ایک بار اس نے مسلسل بہت دیر تک عبداللہ کے سر پر ڈنڈے مارنے کے بعد اسے آلوؤں کی بوری کی طرح قید خانے کے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے بھیجے سے ریاضی نکال کے رہوں گا، چاہے اس کوشش میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے" عبداللہ نے یہ سارا تشدد، ذلت اور ظلم بڑی

بہادری' وقار اور متانت کے ساتھ برداشت کیا' اس کے ساتھی ہر بار اس امید پر اس کی مرہم پٹی کرتے کہ شاید یہ آخری بار ہو لیکن ہوا یہ کہ ایک رات اسی سابق شاگرد نے اسے پھر طلب کیا' عبداللہ نے اپنے سونے کی جگہ پر اپنی چیزیں رکھ دیں مگر پھر وہ کبھی انہیں واپس لینے نہیں آیا۔

ادریس جیکوپووچ کو بھی جو پر یجیڈور کا ایک معروف آدمی تھا اسی طرح مسلسل تشدد کا نشانہ بنایا گیا' ہر تفتیش کے بعد' جن کی تعداد بہت زیادہ تھی وہ زخموں سے چور واپس آتا' ایک دفعہ محافظوں نے اس کا بازو کہنی کے اوپر سے اس طرح توڑ دیا کہ ہڈی گوشت کو کاٹتی ہوئی باہر نکل آئی ایک اور قیدی حسن علسیک نے ہڈی جوڑنے کی کوشش کی اور وہ کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا کیونکہ ادریس کو ہونے والے ناقابل برداشت درد میں واضح کمی ہو رہی تھی' حسن نے لکڑی کے چند دستیاب ٹکڑوں سے ایک کھپچی سی بنا کر ایک گندی ٹی شرٹ کے ذریعے پٹی کر دی تھی اسے تیمارداری کی سزا یوں دی گئی کہ ایک رات حسن کو ایک گارڈ نے دروازے پر بلایا اور اس سے کہا کہ امارسکا "ریڈ کراس" کے کچھ نمائندے اس سے ملنے آئے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ باہر گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

ان کم نصیبوں میں' جو اس تشدد کی تاب نہ لا سکے' موٹر سائیکلوں کا جنونی جاسکو اور اس کا پولیس والا دوست امیر بھی تھا' یہ دونوں کوزارک سے تعلق رکھتے تھے' ان کو ایک رات بارہ بجے لے جا کر ننگا کرنے کے بعد لوہے کے ڈنڈے سے بری طرح پیٹا گیا پھر دو اور قیدی لے جائے گئے جن کے نرخروں پر چاقو رکھ کے حکم دیا گیا کہ وہ کوزارک کے ان دو نوجوانوں کے اعضائے تناسل دانتوں سے کاٹ کر علیحدہ کر دیں' وہ دونوں انتہائی اذیت کی

حالت میں مرے اور ان کی فلک شگاف چیخوں سے سارا کیمپ گونجتا رہا۔ ایسی ہی خوفناک اور ناقابل بیان اذیتیں دے دے کر اور بہت سے لوگوں کو بھی ہلاک کیا گیا' کل ملا کر پریجیڈور کے تقریباً" ایک ہزار باسیوں کو امارسکا کیمپ کے اس ہولناک تجربے سے گذارا گیا' ڈاکٹر ایسو صاد قووچ کا کہنا تھا کہ یہ مظلوم لوگ وہ محب وطن تھے جو اپنی قوم کی آبرو ہوتے ہیں' بربریت کے اس کھیل کے بعد اب یہ علاقہ "امارسکا" کہلانے کے قابل نہیں۔

جیمو کا بھی یہی خیال تھا کہ اب اس علاقے کا کچھ اور نام ہونا چاہیے اور بلاشبہ وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھا۔

پریجیڈور کے مشہور گائیک ملا مسلمووچ کے دو بھائی سناو اور نزاد بھی اسی کیمپ میں تھے' انہیں ہینگر میں رکھا گیا تھا' سناو کی اکثر شامت آتی رہتی تھی ایک بار جب تفتیش کے بعد اسے واپس لایا جا رہا تھا' ایک گارڈ نے اس کے ہاتھوں پر مسلسل ہتھوڑے سے ضربیں لگائیں اور دوسرے نے چاقو کی نوک اس کی کمر میں گھسا کر گوشت کاٹنا شروع کر دیا پھر انہوں نے بجلی کی تاروں سے پھندا بنا کر اس کے پاؤں باندھے اور الٹا لٹکا کر سنگینوں اور لوہے کے ڈنڈوں کی ضربوں سے لہولہان کر دیا۔ سناو ان سب اذیتوں کو کسی نہ کسی طرح سہہ گیا' یہ اور بات ہے کہ اس عمل کے دوران اس کا وزن ساٹھ پونڈ کم ہو گیا۔

نزاد تیس برس کا ایک طویل قامت اور خوش رو نوجوان تھا' اس کے سلیقے سے بنے ہوئے بال بہت خوبصورت تھے' ایک گارڈ نے کھلے میدان کے وسط میں چاقو سے اس کے بال انتہائی بے دردی سے کاٹنے کے بعد اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے بھائی ملا کا گایا ہوا مشہور گانا اسے گا کر سنائے جس کے بول

تھے۔

بوسنیا رو رہا ہے۔

کچھ عرصہ بعد ان دونوں بھائیوں کو جیمو کے زندان میں منتقل کر دیا گیا جہاں انہیں اس مسلسل اذیت سے نجات ملی۔

تمام کے تمام گارڈ ایک جیسے وحشی اور خون کے پیاسے نہیں تھے' ان میں سے کچھ اچھے لوگ بھی تھے لیکن ان گنتی کے چند ایماندار اور رحمدل لوگوں کو امارسکا کیمپ میں دو چار دن سے زیادہ ٹکنے نہ دیا جاتا تھا' عام طور پر ایسے لوگوں کو محاذ جنگ پر بھیج دیا جاتا تھا۔ درونیتا اور گریڈ یسک کے محاذوں پر جانے والے ان لوگوں کی بعد میں کم کم ہی خبر ملتی تھی۔

ایسے لوگوں میں سے ایک آدمی' جسے زیادہ دن رہنے کا موقع ملا' سٹول تھا' وہ پریجیڈور شہر سے تھا اور سب لوگ اسے جانتے تھے وہ حتی الامکان اپنے شہر والوں کی مدد کرتا حالانکہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ مسلمانوں اور کروشیئن لوگوں کی مدد کرنے والے سربوں کو ان کے ہم قوم سخت ترین سزائیں دیتے ہیں۔

تین سرب' جن پر "غیروں" کی مدد کا الزام تھا' امارسکا کیمپ میں لائے گئے۔ یہ اگور کونڈک' اس کی بیوی جدرانکا اور ڈریسکو لوجق تھے' جدرانکا کو دو مہینے بعد رہائی مل گئی اور اس کے پندرہ دن بعد ڈریسکو کو مقدمہ بھگتنے کے لئے بنجالوکا بھیج دیا گیا جبکہ اگور کو جس کا باپ امارسکا ہی میں پیدا ہوا تھا' موت سے قبل طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔

گارڈوں میں سب سے اچھا انسان زیلجکو تھا جسے لوگ محبت سے "زی گی" کہہ کر بھی بلاتے تھے۔ اس کی عمر تقریباً" چالیس برس تھی اور وہ

بھاپ دان پر رکھا اور اپنے صحت مند ہاتھ سے کھڑکی کے فریم کو پکڑ کر بمشکل اپنا سر ٹوٹے ہوئے شیشے تک لایا۔

"میں پندرہ منٹ بعد تمہیں دوبارہ آواز دوں گا' میرے پاس تمہارے لئے ایک تحفہ ہے" زی گی نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا' تھوڑی دیر بعد اس نے جیمو کو ایک بڑا سا پلاسٹک کا ڈونگا دیا جسے ایک سرپوش سے ڈھانکا گیا تھا اور کہا

"اسے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر کھا لو اور پھر ڈونگا مجھے واپس کر دینا" ڈونگا میکرونی اور گاڑھے شوربے والے گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ بعد میں زی گی نے جیمو کو بتایا کہ وہ کھانا اصل میں گارڈوں کے لئے تیار کیا گیا تھا لیکن چونکہ اس روز ایک مقامی چھٹی تھی اور روائت کے مطابق بھنے گوشت اور آلو بخارے سے بنی برانڈی کا خصوی اہتمام کیا گیا تھا' اس لئے یہ بچ گیا ہے یوں محافظوں کے لئے تیار کردہ ڈنر سے قیدیوں کے سوکھے اور سکڑتے ہوئے معدوں میں مدتوں بعد حرارت اور گرمی پیدا ہوئی۔

زی گی جب بھی جیمو کے لئے کھانے پینے کی کوئی چیز لاتا تو اسے ہمیشہ تاکید کرتا کہ وہ اس میں سے کچھ حصہ ان کے مشترکہ ہمسائے بلادا کو ضرور دے۔ بلادا جیمو کے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر رہتا تھا' وہ ایک بہت مخلص اور باکمال آدمی تھا اور ہمیشہ ہر ایک کے کام آتا تھا ایک سہ پہر گارڈ اسے ہوکو' امیر اور سابو سمیت وائٹ ہاؤس کے عقوبت خانے میں لے گئے' اگلے دن ساتھ والے زندان کے ایک قیدی نے جیمو کو بتایا کہ اس نے خود بلادا کا جسم پیلی وین میں منتقل کیا تھا۔

جب جیمو نے یہ سارا واقعہ زی گی کو سنایا تو اسے بے حد صدمہ ہوا'

اگلے روز ڈیوٹی پر آتے ہی زی گی نے جیمو کو بلایا اور بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"اپنا خیال رکھنا جیمو ---- میں آتے ہی سب سے پہلے "فہرستوں" کو دیکھا کروں گا اور اگر میں نے کبھی تمہار نام اس میں دیکھا تو تم سے پہلے انہیں مجھے لے جانا پڑے گا"۔

اتفاق کی بات ہے کہ زی گی کا تعلق گارڈوں کے بدنام ترین گروپ سے تھا جو اپنے موٹی توند والے لیڈر کے حوالے سے "کرکان شفٹ" کہلاتا تھا' اسے لوگ "دہشت شفٹ" بھی کہتے تھے' ان میں سے دو بدترین سفاکوں کو ان کے ساتھی "پس پلج" اور "سوسک" کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ انتہائی شقی القلب انسان نما حیوان تھے جو بغیر کسی وجہ کے صرف اپنے دل کی ترنگ پر بندہ مار دیتے تھے' کسی قیدی کی زندگی ختم کرنے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ انہیں اس کا چہرہ یا چلنے کا انداز پسند نہیں آیا' ایک دفعہ انہوں نے رڈر فٹ بال کلب کے مشہور کوچ اور کھلاڑی بجرام گاگ کو صرف دس منٹ میں باقی قیدیوں سے دو سو جرمن مارک جمع کرنے کا حکم دیا (چونکہ انہیں خود اپنی نام نہاد سرب جمہوریہ کی جاری کردہ کرنسی پر اعتماد نہیں تھا) دس منٹ بعد وہ آئے اور تقاضا کیا کہ رقم ان کے حوالے کر دی جائے۔

گاگ نے انہیں بتایا کہ اس کے پاس نہ تو مطلوبہ رقم ہے اور نہ ہی اس نے اپنے ساتھی قیدیوں سے اسے جمع کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان بے چاروں کے پاس اب پھوٹی کوڑی کا ہونا بھی محال ہے' اس کے قریب کھڑے قیدیوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا گیا۔ سوسک دروازے کے قریب اپنی رائفل لوڈ کئے اور ٹریگر پر انگلی جمائے کھڑا تھا پس پلج نے گاگ کو اس بری

طرح مارنا شروع کیا کہ تماشائی قیدیوں کو اپنے دل لٹتے ہوئے محسوس ہوئے، اچانک گاگ دہشت سے سمٹے اور ششدر قیدیوں کے اوپر سے اچھلا اور اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر ہوا میں گھومتا ہوا کھڑکی سے جا ٹکرایا جس کے شیشے ٹوٹ کر چاروں طرف بکھر گئے، گاگ نے شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس سے اپنی کلائی کی نسیں کاٹنے کی کوشش کی تاکہ ان ظالموں کی مسلسل وحشیانہ مار پیٹ سے مر کر رہائی حاصل کر سکے، کچھ قیدیوں نے لپک کر اسے روکنے کی کوشش کی، دونوں وحشی درندے گاگ کو اٹھا کر باہر لے گئے جس کے بعد وہ کسی کو نظر نہ آیا۔

اسی طرح ایک بار اپنی وحشی نفرت کے جوش میں ایک گارڈ نے براکو برازووچ کو جا پکڑا جو دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ اور قیدیوں کے ساتھ باہر کھلے میں بیٹھا تھا، براکو اس علاقے میں یوگوسلاوی فوج کی بھرتی کے محکمے میں کام کیا کرتا تھا، گارڈ نے کہا

"تو تم ہو وہ براکو، جو فوجی بھرتی کیا کرتا تھا"۔

"ہاں میں ہی وہ براکو ہوں، براکو نے ایک عجیب سی خالی خالی آواز میں جواب دیا۔

"حرامزادے، ماں کے خصم، یاد ہے تم نے مجھے آرمڈ ڈویژن میں بھیجنے سے انکار کیا تھا تو لو اب تمہاری رخصت کا وقت آ گیا ہے"۔

اس کے بعد اسے آخری بار وائٹ ہاؤس کے عقوبت خانے کی طرف جاتے دیکھا گیا۔

جب نئے قیدی کیمپ میں لائے جاتے، اور یہ واقعہ ہر روز ہی ہوتا تھا، تو بس سے اترتے ہی انہیں سنگینوں پر دھر لیا جاتا جس کی وجہ سے بہت سوں

کو قید خانے تک پہنچنا نصیب ہی نہ ہوتا تھا' گارڈ ان کے سروں کو پختہ دیواروں کے ساتھ انتہائی وحشیانہ انداز میں ٹکراتے جس سے ایک ہولناک آواز پیدا ہوتی کھوپڑی چٹخنے اور ہڈیوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی آواز ---- اس آواز میں مرنے والوں کی تیز چیخوں اور پردرد کراہوں کی آواز مل کر زندان میں موجود قیدیوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتی اور انہیں اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوتے اور یہ دائرہ در دائرہ بلند ہوتی ہوئی آواز پہاڑی کووں کے غول کی طرح کوزارا کی داری میں پھیلتی چلی جاتی۔ دہشت ایک آسیب کی طرح ان کی روحوں پر جیسے جم سی جاتی' خوف ان کی کھال سے ہوتا ہوا ان کی ہڈیوں میں سرایت کر جاتا اور رگوں کے آر پار ہوتا ہوا ان کے جسموں پر پسینے کے ننھے ننھے قطروں کی شکل میں سر سے پاؤں تک پھیل جاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے بدی اس سرحدی قصبے کے ایک ایک انچ میں رچ بس گئی ہو۔

ممکن ہے جنگ اور موت میں سب کچھ جائز ہوتا ہو مگر جسمانی اور ذہنی اذیت کے جو ہولناک اور مریضانہ ذہنیت کے حامل واقعات امارسکا کیمپ میں پیش آئے ان کی وحشت ناکی بیان سے باہر ہے' یہ فوج کے ذریعے عوام کی ایسی اجتماعی آبروریزی تھی۔ جس میں دکھ اور اذیت کا اسلحہ فراوانی سے استعمال ہوتا تھا۔

مجیکا' جو پریجیڈور کا جانا پہچانا موسیقار اور انتہائی خوش طبع انسان تھا' ایک بہت سچی بات کہا کرتا تھا وہ کہتا تھا کہ ہر صبح بیدار ہونے پر وہ اپنے چہرے اور جسم کو اپنی انگلیوں سے چھوتا ہے اور پھر اپنے آپ سے کہتا ہے کہ "سب ٹھیک ہے میں آج بھی ابھی تک زندہ ہوں"۔

دو تین ماہ بعد وہ کیمپ سے رہا ہو گیا لیکن چند ہی روز بعد گردے فیل ہو جانے کے باعث مر گیا کیونکہ پریجیڈور میں اس کی بیماری کے لئے نہ تو مطلوبہ دوا تھی اور نہ ہی وہاں سے باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ ابھی وہ صرف تیس برس کا تھا۔

لوگ کہتے کہ ان گارڈوں کی روحیں نفرت اور بربریت سے تربتر تھی اور ان کی خوراک ہم مظلوم قیدیوں کی بے بس جانیں ہیں لیکن یہ کچھ بھی کر لیں ہم سب کو فنا نہیں کر سکتے۔

کسی شخص کو موٹر آئل پینے پر مجبور کرنے کا ہولناک منظر ہو یا کسی گارڈ کا ایک نہتے اور بے بس قیدی کے سر میں پیچھے سے گولی مارنے کے بعد تماشائیوں سے داد لینے کا تقاضا! پریجیڈور کی فٹ بال ٹیم کے گول کیپر درات کے جھلسے ہوئے چہرے پر نقش وہ خوف ہو جب اس کا سر ایک جلتے ہوئے ٹائر کے اندر گھسیڑ دیا گیا تھا یا ایک ہڈیوں کے ڈھیر جیسے منگی انسان کا ڈھانچا جو ایک

مرے ہوئے کبوتر کو کھانے کی کوشش کر رہا تھا' یا اس روتے ہوئے بچے کے آنسو جسے اپنے آپ باپ کے جسم کو ان ظالم درندوں کے خنجروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھنے پر مجبور کیا گیا تھا .... یہ سب کچھ بہت خوفناک تھا۔

صبح سے شام تک پھیلتی ہوئی مسلسل اذیت اور مردہ اور مرتے ہوئے جسموں سے اٹھنے والی سڑانڈ کا تاثر اس قدر اعصاب شکن اور ہولناک تھا جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا جیمو کو بوسنین شاعر عزت سراج لک کی ایک نظم یاد آئی۔

وہ اٹھائیس تھے
یا شاید پانچ ہزار اٹھائیس تھے
یا شاید اس سے بھی کہیں زیادہ
ایک ہی نظم میں جمع تھے وہ سب عشاق آزادی کے دیوانے
جو اگر زندہ ہوتے تو صاحب اولاد ہو چکے ہوتے
لیکن اب وہ سب مقتل کا رزق بن چکے تھے۔
اور اجتماعی قبروں میں دفن ہیں
اے میرے پیارے میری متاع جاں
آ آج کی شب ہم ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کریں
ان سب بے نام شہیدوں کی یاد میں۔

چھٹا باب

امارسکا کیمپ کے گرد خاردار تاریں نہیں تھیں مگر اس کے باوجود وہ ایک سنگی قلعے کی طرح مضبوط اور محفوظ تھا۔ تین حفاظتی حلقوں کی شکل میں گارڈ اس کے چاروں طرف پہرا دیتے تھے اور ہر حلقے میں تیس گارڈ تھے پہلا حفاظتی حلقہ کیمپ کے اندر تھا اس سے پچاس گز کے فاصلے پر دوسرا اور پھر مزید پچاس گز آگے تیسرا۔ پہلے دو حلقے کیمپ کے اندر موجود قیدیوں کی نگرانی پر مامور تھے تاکہ کوئی بھاگ نہ سکے اور تیسرا بیرونی حلقہ ممکنہ حملہ آوروں سے دفاع کے لئے تھا۔ صرف دو قیدی ان تینوں حلقوں کو توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوسکے۔ ایک کو نزدیکی سرب ٹاؤن گریڈینا کے لوگوں نے پکڑ لیا جسے کیمپ میں واپس لا کر فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دوسرا امارسکا کیمپ سے چھ میل کے فاصلے پر اپنے تباہ شدہ گاؤں کو ذراوسا پہنچنے میں کامیاب ہو گیااور تقریباً" ایک ماہ تباہ شدہ ملبے کے ڈھیر پیچھے چھپا رہا' قدرے مطمئن ہونے کے بعد اس نے پری جے ڈور کا رخ کیا مگر ٹانگ پر گولی کھا کر دوبارہ گرفتار ہوگیا جہاں سے اسے امارسکا کیمپ میں لایا گیا مگر اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہ مل سکی' کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ٹانگ کے زخم میں زہر پھیل جانے کے باعث مر گیا تھا کیونکہ اسے کسی قسم کی طبی سہولت فراہم نہیں کی گئی تھی۔

اسطرح کی اموات روزمرہ کا معمول تھیں' عموماً" تیز دھار اور زنگ آلود ہتھیاروں سے لگے ہوئے زخم مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ایک دو دن تک رستے رہتے اور پھر سوج کر ایک سرخی مائل لوتھڑا سا بن جاتے' زخم

کے کھرنڈ سے پیپ مسلسل ٹپکتی رہتی' ایک مریض نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سر کے زخم سے وہ کیڑے نکالے جو عام طور پر لاشوں میں پڑا کرتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود وہ بچ گیا۔ کچھ قیدی موت کے اس کھیل سے محض اس موہوم اور انتہائی کمزور امید کے سہارے بچ گئے کہ ایک نہ ایک دن یہ ظلم کی رات ختم ہو جائے گی۔ کم خوراکی کمزوری ماس خورے کی بیماری اور کمزور مکڑیوں جیسی ٹانگوں کے ساتھ وہ زندہ مردوں کی طرح بمشکل اپنی جگہ سے حرکت کر پاتے۔ غلیظ اور نم آلود کالروں اور جوؤں سے بھرے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس وہ انسانی ڈھانچے پسینے سے بھرے ہوئے جسموں اور ننگے پاؤں کی ساتھ (جن کے پچکے ہوئے رخساروں پر ایک موم رنگ سا مواد جما رہتا تھا) چلتے تو بھوتوں کی طرح لگتے تھے۔

ناقابل برداشت چلچلاتی دھوپ' چاروں طرف بھنبھناتی ہوئی مکھیاں اور سروں اور کپڑوں میں سرسراتی ہوئی جوئیں!! یہ زندگی کا وہ روپ تھا جس کے بارے میں شائد انہوں نے کبھی تصور میں بھی نہ سوچا تھا ان میں سے وہ جو طبعی طور پر صابر و شاکر تھے' ان کی امید بھی جواب دے چکی تھی' مایوسی اور بے چارگی اور ایک مسلسل توہین کا احساس دن بدن ان کی روحوں میں اترتا چلا جا رہا تھا اور وقت جو فنا کی عدالت کا ثالث اعلیٰ ہے اتنی آہستگی سے گزر رہا تھا کہ ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

یہ بغیر آنسوؤں اور بغیر آواز کے رونے کے دن تھے' دعائیں تک حرفوں سے خالی ہو گئی تھیں' یوں لگتا تھا جیسے قیدی' مقدمے کی سماعت اور سزا کے اعلان کے بعد کیمپ کی ہر تکلیف کو سہنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ ہو چکے ہوں۔ چاروں طرف ایک اداسی کا ہالہ سا تنا تھا اور معمر ترین قیدیوں کو بھی

اس موسم گرما سے زیادہ غم آلودہ موسم یاد نہیں تھا کوزارا کی پہاڑیوں پر اگی گھاس سورج کی حدت سے جھلس چکی تھی رات کے وقت بے رنگ سا چاند لکڑی کی ایک کھچی کی طرح آسمان پر ڈولتا رہتا اور کیمپ کے اندر موجود قیدیوں کے برہنہ سینوں پر موت قطرہ قطرہ گرتی اور ان کی بے کس اور لاچار روحوں تک پھیل جاتی۔ موت محافظوں کی آنکھوں میں ہمہ وقت رقص کناں رہتی۔ ان کے جسم تیز دھار ہتھیاروں کی صورت اختیار کر چکے تھے اور ان کے قدموں کی دھمک قیدیوں کے لئے موت کی گھنٹی بن چکی تھی' ہزاروں جانیں ان کی ٹریگروں پر رکھی ہوئی انگلیوں' خنجروں پر دھرے ہاتھوں اور خون آشام وردیوں کی چھوٹی جیبوں میں رکھے موت کے پروانوں کے باعث زندگی اور موت کے بیچوں بیچ معلق رہتیں۔ یہ موت کے پروانے جنہیں گارڈ استعمال شدہ بے کار ٹشو پیپروں کی طرح استعمال کرتے تھے' پری جے ڈور اور اس کے مضافاتی علاقوں سے پکڑے گئے' ان بے قصور اور مظلوم لوگوں کی تقدیر بن چکے تھے۔

امارسکا کیمپ میں زیادہ تعداد کو زارک کے لوگوں کی تھی اور گھر بھی انہی کے سب سے زیادہ تباہ ہوئے تھے۔ اس علاقے کے لوگ کچھ تو موقع پر قتل کردیے گئے اور باقیوں کو اپنے سابقہ ہمسایوں کے خون آلود خنجروں کی نوکوں پر ایک طویل اور پر اذیت سفر کرنا پڑا جس کا اختتام پری جے ڈورر کے نواح میں واقع برزیکانی' قراترم' ٹرنوپولجی یا امارسکا کیمپ میں ہوا۔ امارسکا کیمپ میں لائے گئے تقریباً" دو ہزار کوزارک کے باشندوں میں ایک پچیس سالہ دوکاندار قاسم گراز ڈینک اور اسکا بیٹا سعد بھی تھا جسے اس کے بے تکلف دوست "سووو" کے عرف سے بلایا کرتے تھے۔ وہ جیمو کے زندان سے باہر

میدان کے کنارے واقع ہینگر میں رکھے گئے تھے۔ یہ لوگ اپنے تباہ ہوتے گاؤں پر ہونے والی شدید گولہ باری کے دوران کوزارا کی ان پہاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے پکڑے گئے تھے جن کے دوسری طرف گھنے جنگلوں میں پناہ لی جاسکتی تھی۔ گولہ باری سے ہونے والی شدید تباہی سے بچنے کے لئے وہ دیوانہ وار ایک ایسی سمت میں بڑھتے گئے جو انہیں اس جہنم سے محفوظ فاصلے پر لے جائے۔ انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جارہے ہیں! وہ اپنی ہی طرح کے ہزاروں اور لوگوں کے ساتھ گرفتار ہوئے اور پری جے ڈور کے تھانے میں لائے گئے' جہاں دو دن کے تشدد کے بعد انہیں امارسکا کیمپ منتقل کردیا گیا' قاسم کا بھائی اور اس کے تین بیٹے بھی ان پکڑے جانے والوں میں شامل تھے۔

پہلے انہیں "چھبیس" نامی بدنام عقوبت خانے میں رکھا گیا جو ہینگر کے بالائی حصے میں واقع تھا اور پھر نیچے کے وسیع ہال میں منتقل کردیا گیا جہاں کم و بیش ایک ہزار قیدی اپنے ایام اسیری گزار رہے تھے' ان کے سونے کے لئے سیمنٹ کا وہ ننگا فرش تھا جس پر جا بجا پٹرول اور گندے موٹر آئل کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ بنے ہوئے تھے اور جسے خاردار تاروں کے ذریعے باقی جگہ سے علیحدہ کردیا گیا تھا' ہینگر کی بالائی منزل پر پچاس پچپن قیدیوں کی گنجائش والے چھوٹے چھوٹے بندی خانے تھے' اس سے اوپر والی چھت پر جو فرش سے تقریباً" 45 فٹ بلندی پر واقع تھی لوہے کے بڑے بڑے گرڈروں کے درمیان کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے' ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ پر بے شمار جوئیں بارش کے قطروں کی طرح قیدیوں پر گرتیں۔ ناقابل برداشت سڑانڈ کی وجہ سے لوگ ہمہ وقت ابکائیاں لیتے رہتے کیونکہ وہاں ہوا کی آمدورفت کے

لیے کوئی کھڑکی نہیں رکھی گئی تھی چھت کے قریب اینٹوں سے بنے شیشہ لگے چھوٹے چھوٹے کچھ روشندان تھے اور بس۔ کبھی کبھی گارڈ بڑے دروازے کھول دیتے جن سے پرانے وقتوں میں شکستہ اور مرمت طلب آلات لائے لے جاتے تھے۔

قاسم اور سودو کو اوپر کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے عین نیچے جگہ ملی تھی جس کے اوپر واقع بندی خانے' اگلے وقتوں میں کانوں کے انتظامی دفاتر کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ قاسم نے اپنی پرانی ہوا روک کر جیکٹ اتار کر اپنے بیٹے کے لئے فرش پر بچھا دی تھی جو ننگے اور گندے فرش پر لیٹتا تھا۔ اضطراب قاسم کے پچکے ہوئے رخساروں میں ٹھہر سا گیا تھا' اس کے بال پیش از وقت بڑھاپے کی علامت بن کر سفیدی مائل ہو رہے تھے' اس کے چہرے پر زردی کھنڈتی جا رہی تھی مگر اس کی آنکھیں اب تک ایک اندرونی مزاحمت کے جوش سے روشن تھیں۔

سودو چوبیس برس کا تھا' اس کی آنکھوں میں موجود بلوغت کا شعلہ اس بات کا شاہد تھا کہ وہ اپنا لڑکپن پیچھے چھوڑ آیا ہے' اس کا قد لمبا اور جسم ورزشی تھا وہ ایک ایسا وجیہہ جوان تھا جس کی طرف کوئی بھی لڑکی فوراً" مائل ہو سکتی تھی لیکن اب وہ دن رات آہستہ آہستہ گھل رہا تھا' اس کے شاداب اور جوان چہرے میں پتھر کی سی سختی گھر بنا رہی تھی' اس کی آنکھیں اپنی چمک سے محروم ہو کر اندر کی طرف دھنستی جا رہی تھیں' اور ان کے گرد سیاہ ہالے رونما ہو رہے تھے اس کی ڈھیلی پڑتی جلد کی رنگت مدھم اور بدرنگ ہو گئی تھی اور اس کی پتلی ٹانگیں فرش میں ٹھکی ہوئی سی لگتی تھیں۔ بری خوراک اور غلیظ اور مضر صحت ماحول کی وجہ سے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی

پیچش کا مریض بن چکا تھا' یہ ایک بہت ہی تکلیف دہ صورت حال تھی کہ ہر چند لمحوں بعد مریض کو رفع حاجت کے لئے اس عالم میں بھاگنا پڑتا کہ اس کی زخمی آنتیں اندرونی دباؤ سے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مریض اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکتا اور ٹائلٹ تک پہنچنے سے پہلے پہلے پاخانہ اس کی ٹانگوں اور پتلون سے رستا ہوا رستے میں پڑے قیدیوں اور فرش کو آلودہ کردیتا اور اس کے بعد ٹائلٹ کے دروازے پر ہمیشہ ایک گارڈ اس بدنصیب کو اس حرکت کی سزا دینے کے لئے موجود ہوتا تھا۔

سودو شدید کمزوری اور نقاہت کے باعث کھانا کھانے کے لئے بھی نہیں جا سکتا تھا' اس کا باپ قاسم بھی ایسا ہی کرتا کیونکہ وہ اپنے محبوب بیٹے کو ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا' اس نے کچھ جرمن مارک بچا کر چھپا رکھے تھے جن سے وہ سودو کے کھانے کے لئے کچھ بسکٹ خرید لیتا اور پھر بڑی محبت اور اصرار سے اسے یہ سمجھاتے ہوئے کھلاتا کہ اس کی صحت کے لئے کھانا بہت ضروری ہے' وہ یہ الفاظ اس طرح ادا کرتا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ سودو کہنی کے بل کروٹ لے کر بمشکل تھوڑا سا اوپر کی طرف اٹھتا تاکہ باپ بسکٹ اس کے منہ میں ڈال سکے' وہ دیر تک آہستہ آہستہ اسے چباتا رہتا ور پھر بہت مشکل سے اسے نگلتا جس کی وجہ سے اس کا سارا چہرہ تکلیف کی شدت سے اکڑ سا جاتا' معدے میں پڑنے والے بلوں کی وجہ سے اسے کھانسی کا دورہ سا پڑتا جس کی وجہ سے اس کی سانس رکنے لگتی تھی۔ کرب کی بڑھتی ہوئی شدت اور حرارت سے قاسم کی آنکھیں سلگ اٹھتیں اور اسکا جی چاہتا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے اور اپنی پوری آواز اور قوت سے چیخے اور چلائے۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس طرح اس کا درد ہلکا ہو سکتا ہے' مگر وہ اپنے بیٹے کی

وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا تھا اس کا سارا کرب ان چند چمکتے ہوئے آنسوؤں میں سمٹ آتا جو آہستہ آہستہ اس کے جھلسے ہوئے رخساروں پر بہہ نکلتے تھے لیکن اس کی آنکھوں میں مدافعت کی حدت اس وقت بھی کم نہ ہوتی تھی جب وہ اپنی انگلیاں چٹخاتا ہوا دعائیہ انداز میں اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتا تھا۔

"نکلو چلو سب باہر نکلو"

ایک گارڈ جس کی پشت بڑے دروازے کی طرف تھی غرایا۔

قاسم کو پتہ تھا کہ سودو کو بھی اس حکم کی تعمیل کرنا ہو گی' اسے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ کیا سودو وہاں رک سکتا ہے؟ کیونکہ اگر وہ مان بھی جاتا تو اسے مکرنے میں دیر نہیں لگنی تھی لہذا قاسم نے بمشکل سودو کو اس کی کمزور ٹانگوں پر کھڑا کیا اور سہارا دے کر باہر کھلے میں لے آیا۔

"اپنے کپڑے اتارو ----- سب کے سب"

ایک گارڈ غصیلی آواز میں گرجا "تمہاری بدبو کی وجہ سے ہم لوگ ہینگر میں داخل نہیں ہوسکتے"۔

ایک اور گارڈ کے ہاتھ میں پانی کا موٹا پائپ تھا جس کی تیز دھار پکے فرش پر زوردار آواز کے ساتھ پڑ رہی تھی۔ قاسم کو ناقابل بیان شرم کا سامنا تھا کہ اس کے بیٹے کو یہ ساری توہین اور بے شرمی برداشت کرنا پڑے گی۔ قیدیوں کے استخوانی ڈھانچے اپنے چیتھڑوں سے جدا ہونے پر پہلے سے بھی زیادہ قابل رحم منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ دس دس کی ٹولیوں میں پائپ کی دھار تلے بھیجے جا رہے تھے ۔ قاسم اور سودو کی باری بھی آ گئی جب وہ پائپ بدست گارڈ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے تو اچانک اس نے پائپ کا رخ ان کی طرف کر کے پانی چھوڑ دیا ٹھنڈے پانی کی تیز اور طاقتور دھار چابک کی طرح ان کے

جسموں سے ٹکرائی وحشیانہ قہقہے لگاتے اور تمسخر آمیز جملے کستے گارڈوں نے ان کے کمزور اور مدقوق جسموں کے ساتھ یہ بے رحم اور اذیت ناک کھیل بہت دیر تک جاری رکھا۔ سودو نے تکلیف سے دوہرا ہو کر اپنی کمر پانی کی طرف کرنے کی کوشش کی شدید تکلیف میں اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دباتے ہوئے اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے باپ کی برہنگی سے منہ موڑنے کی کوشش کی جبکہ قاسم اپنے جسم کو ڈھال بنا کر بیٹے کو پانی کی شدید ضربوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا' کچھ قیدی اپنے کھلے زخموں پر پڑنے والی پانی کی ضربوں سے بری طرح چیخ رہے تھے جو ذرا صحت مند اور حوصلے والے تھے وہ پانی کے چند قطرے اپنے حلق میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ سوکھے ہوئے گلوں کو کچھ نمی فراہم کر سکیں لیکن پانی کے دباؤ کی وجہ سے ان کا سانس رک جاتا تھا' گارڈ جان بوجھ کر پانی کا رخ ان کی طرف رکھتے اور بہیمانہ طور پر ان کی اس حالت سے محظوظ ہو کر ہنستے' قیدیوں کی یہ بے چارگی ان کے لئے ایک ذریعہ تفریح تھی اگرچہ یہ سارا کھیل کوئی بہت زیادہ طویل نہیں تھا مگر قیدیوں کے لئے یہ جیسے ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس کے بعد قیدیوں نے اپنے ریزہ ریزہ کپڑے اٹھائے اور ہینگر کی طرف دوڑ لگا دی' قاسم اور سودو سب سے آخر میں تھے۔

جونہی قیدی ہینگر میں داخل ہوئے ان کی کمروں اور سروں پر ڈنڈوں کی بارش شروع ہو گئی جس کے ساتھ محافظوں کی غلیظ گالیاں بھی شامل تھیں قاسم کی قمیض دروازے کے ہینڈل سے اٹک گئی اور اس سے پہلے کہ معاملہ اس کی سمجھ میں آتا کم از کم دس ڈنڈے اس کی تواضع کر چکے تھے اس نے قمیض کو کھینچنا چاہا تو وہ درمیان سے پھٹ گئی وہ بھاگ کر ہینگر کے خاردار

تاروں والے حصے میں آگیا تاکہ مزید مار پیٹ سے بچ سکے۔

اس رات سودو کو تیز بخار ہوگیا اور اس کے معدے کے درد میں شدید اضافہ ہوگیا' درد کا ایک گولہ سا اٹھتا اور اس کے دماغ کی طرف چڑھتا جس سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا اسے ارد گرد کھڑے لوگوں کی آوازیں پہچاننے میں دقت ہو رہی تھی' اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے قاسم کو اپنے چہرے پر جھکے ہوئے دیکھا جس کی پسینے سے بھری انگلیاں اس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں' ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے اندر آتے ہوئے بلب کی روشنی اس کے چہرے پر عجیب و غریب نقش بنا رہی تھی۔

"ابا" .... سودو نے ناقابل سماعت قسم کی سرگوشی میں کہا' جسے سننے کے لئے اس کا باپ مزید اس کے قریب سمٹ آیا۔ "مجھے اپنی موت کا غم نہیں ہے ابا' مجھ سے یہ سب کچھ اب نہیں دیکھا جاتا۔ آخر ہم نے ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟"

قاسم نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ سودو اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکے۔

چھت کے قریب بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے روشندانوں سے صبح کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی' سودو کے لئے سانس لینا دشوار تر ہو رہا تھا مگر پھر بتدریج اس میں ایک خاص طرح کی ہمواری پیدا ہونے لگی اور وہ چھوٹے چھوٹے سانس لینے لگا' زندگی اس کے نیم جان جسم سے قطرہ قطرہ نکلتی جا رہی تھی اور اس کی چوبیس سالہ زندگی کا چراغ بجھ رہا تھا۔

"ابا .... پلیز ...." اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے آخری الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی بکھر کر رہ گئے ہینگر میں ایک گہری غم آلود خاموشی کا سایہ

پھیل گیا اور کسی کونے سے خدا کو کوسنے کی آواز سنائی دی۔ قاسم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا' اس نے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور دیر تک اسی حالت میں یوں کھڑا رہا جیسے ہو پتھر کا ہو گیا ہو۔ اس کا چہرہ غم و غصہ کی شدت سے بگڑ کر عجیب سا ہو گیا تھا' اس نے اپنی سسکیوں اور اشکوں کے امنڈتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے اپنی کلائی پر زور سے کاٹا اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر اس کی روح میں آنسو ہی آنسو تھے جن میں ایک باپ کا دکھ موجزن تھا' اسے کچھ دکھائی اور سجائی نہیں دے رہا تھا' سامنے پڑے بیٹے کی لاش نے اس سے زندہ رہنے کا بنیادی مفہوم چھین لیا تھا۔ مرے ہوئے بیٹے کی شبیہہ اس کے سینے کی بھٹی میں جلنے کے بعد ایک روشن انگارے کی طرح سلگ رہی تھی' وہ اپنی بیوی کو (اگر وہ ابھی تک زندہ ہے تو) کیسے یہ بتائے گا کہ ان کا بیٹا .... اس کا پیارا لخت جگر......... اس کی آنکھوں کا نور اب اس دنیا میں نہیں ہے .... اور سعادہ .... سودو کی بہن کیسے یہ صدمہ جھیل سکے گی۔؟؟؟

قاسم اسی سکتے کے سے عالم میں کھڑا تھا کہ ایک گارڈ اس کی طرف آیا اور سودو کے بے جان جسم کو ٹھوکر مار کر بولا۔ یہ کیا ہے اور یہاں کیوں پڑا ہے؟ قاسم منہ سے کچھ نہیں بولا مگر اس کی آنکھیں خنجر کی طرح گارڈ کی طرف اٹھیں۔ اس کی نفرت اور انتقام بھری نگاہ ایک زخم کی طرح اس کے چہرے پر نقش تھی۔

گارڈ نے اپنی وحشیانہ سفاکی چھپانے کی کوشش کئے بغیر نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کو مرے کم از کم تین دن ہو چکے ہیں۔ اس کوڑے کو فوراً اٹھا کر پھینکو" قاسم کے ہونٹ گارڈ سے کچھ کہنے یا اس کے منہ پر

تھوکنے کے ملے جلے انداز میں ہلے مگر پھر وہیں کے وہیں رہ گئے' وہ ایک گونگے بہرے کی طرح خاموش کھڑا سودو کے مردہ جسم کو ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ دل ہی دل میں کسی ان دیکھے انصاف کے سامنے کوئی ایسی قسم کھا رہا ہو جس کا مدعا سودو پر ہونے والے ظلم کا بدلہ چکانا ہو۔

قاسم اسی طرح کھڑا رہا' اس دوران میں اس کا بھائی اور بھتیجے سودو کی لاش کو اٹھا کر باہر کھلے میں ایسی جگہ رکھ آئے' جہاں اور بہت سی بے گور و کفن لاشیں ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں بعد میں ساری لاشیں پیلے ٹرک میں لاد دی گئیں۔

قاسم نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی "اس کی جوانی یہیں کہیں کسی خندق میں دفن کر دی جائے گی .... کیا میں کبھی اس گڑھے کی شناخت کر سکوں گا؟" اب اس کی باتیں باقی عمر کا محور یہی ایک سوال رہ گیا تھا!

ساتواں باب

سودو کی موت سے اگلے دن چھ اگست کو صبح سویرے کی حاضری غیر معمولی طور پر طویل ہو گئی' قاسم کا نام بھی طلب کئے جانے والوں میں شامل تھا' اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کو بغلوں میں دبائے قیدی باہر کھلے میدان میں جمع ہو گئے کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے! انہیں دس دس کی قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا اور ایک مونچھوں والے گارڈ نے ان کے نام پکارنے شروع کر دیئے' دوسرے گارڈ وقفے وقفے سے قیدیوں کی نئی فہرستیں لا رہے تھے' چاروں طرف ایک حیرت کا شامیانہ سا تنا تھا کیونکہ آج تک دن کی روشنی میں کبھی اتنے قیدیوں کو ایک ساتھ بغرض تشدد اس طرح جمع نہیں کیا گیا تھا۔ جیمو کے دماغ میں ایک اندیشہ سرسرایا' کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سب کو ایک ساتھ

....

لیکن اسے اس سے آگے اس منطقی انجام تک سوچنے کی جرات نہ ہوئی جس کا دروازہ صرف موت کی طرف کھلتا تھا۔

ایک گروپ جس میں جیمو کے کزن فاضل اور فودو بھی شامل تھے' ایک طرف لے جایا گیا' اور پھر یکدم خبر ملی کہ انہیں آزاد کیا جا رہا ہے اور امارسکا کا کیمپ ختم ہو رہا ہے' چند ہی لمحوں میں ہر لب پر یہی ذکر تھا۔

قیدیوں کے نام پکارے جانے کا یہ سلسلہ سہ پہر اس وقت تک جاری رہا جب امارسکا شہر کی طرف سے گرد و غبار اڑاتی ہوئی پہلی بس وہاں پہنچی' اس کے بعد دوسری پھر تیسری۔ تھوڑی دیر میں بیس سے زیادہ بسیں وہاں جمع ہو گئیں' ہلکی ہلکی زیر لب مسکراہٹیں قیدیوں کے ان پژمردہ چہروں پر پرچھائیوں

کی طرح ابھرنے لگیں جو ہر طرح کی خوشی کے تاثرات سے نامانوس ہو چکے تھے' خوشی کے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ وہ بار بار ایک دوسرے کو گلے لگاتے۔ جیمو کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ تھرتھرائی جس میں درد کا کھچاؤ بھی شامل تھا اور یہ سوال بھی۔ "کیا واقعی عذاب کی یہ رات ختم ہو رہی ہے؟"

قیدی اب محافظوں کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اپنی مسرت کا اظہار کر رہے تھے جس کا جواب انہیں ایسی طنزیہ اور مذاق اڑانے والی نظروں سے مل رہا تھا جن کا تاثر یقیناً خوشگوار نہیں تھا۔ بسیں قطار میں لگا دی گئیں' ان کے ساتھ دو فوجی ٹرک اور دس خوب مسلح فوجی بھی تھے' پہلی دو بسوں میں ان قیدیوں کو سوار کیا گیا جو گذشتہ چند دنوں سے گیراج میں رکھے گئے تھے' باقیوں کو مختلف گروپس میں ترتیب دیا گیا' محرم نذیرووچ جو پریجیڈور ریڈیو کا ایک سابق پروڈیوسر تھا جیمو کے گروپ میں تھا اسی گروپ میں کوزارک کا سعید سوقتک بھی تھا جس کی پریجیڈور میں عینکوں کی دکان تھی' حلاد کے بھائی سناد اور نزاد کو دوسری بس میں جگہ ملی۔

اپنے ہم سفروں میں سے جیمو اور کسی سے واقف نہیں تھا بس میں سوار ہوتے ہی انہیں سر جھکائے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ تقریباً" ایک سو آدمی چالیس آدمیوں کی گنجائش والی بس میں اس طرح ٹھونسے گئے تھے کہ کچھ سیٹوں پر کچھ ان کے نیچے کچھ فرش پر اور کچھ ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ جیمو نے دو اجنبی نوجوانوں کو اپنی سیٹ پر جگہ لینے کو کہا جو ڈرائیور کے پیچھے داہنی طرف دوسرے نمبر پر تھی' محرم اور سعید ان کے بالمقابل بیٹھے تھے' تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہر بس پر تین تین فوجی سوار ہوئے اور بسیں چل پڑیں۔

کچھ بسوں کا رخ ٹرنوپولیجی کیمپ کی طرف تھا جہاں سے قیدیوں کو رہا کیا جانا تھا لیکن باقی کی تمام بسیں جن پر تقریباً تیرہ سو قیدی سوار تھے مخالفت سمت میں واقع منجکا کے بدنام کیمپ کو روانہ ہوئیں ...... امارسکا کیمپ میں صرف 184 قیدی باقی رہ گئے۔

بسوں کے اس کارواں کے دونوں طرف ٹرکوں پر سوار پر ییڈور کی " خصوصی فوج" کے "جیالے" تھے جن کی مشین گنوں کا رخ ہمہ وقت بسوں کی طرف رہتا تھا' شہدوں اور لفنگوں کے اس گروہ کا چیف کمانڈر زوران بابک تھا جسے عرف عام میں "باکن" کہہ کر بلایا جاتا تھا وہ بہت ورزشی جسم کا مالک تھا اور اس حوالے سے پر یجیڈور شہر کی اس سے بہت امیدیں وابستہ تھیں لیکن اب اس کی اتھلیٹکس کی ساری کارروائی اور کارنامے' دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس کوڑے تک محدود تھے جس کے کف ہمیشہ بانکپن کی نمائش کے لئے کہنیوں تک الٹے رہتے تھے۔

بسیں امارسکا گاؤں کے داخلے کے مقام پر رک گئیں' ایسے تمام قیدی جو زیادہ زخمی تھے یا جن کے زخم نمایاں طور پر نظر آتے تھے وہاں اتار دیئے گئے' اپنی مرضی سے کوئی نہیں اترا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا مطلب ذبح ہونا ہے جسے قاتل سرب "شارٹ کٹ" کا نام دیتے تھے' اس کے بعد مرجا نامی ایک آدمی ایک ڈنڈا لئے بس کے اندر داخل ہوا اور بلا تفریق قیدیوں کی دھنائی کرنے لگا' وہ فرش پر پڑے ہوئے قیدیوں کے جسموں پر پاؤں رکھتا ہوا چاروں طرف ڈنڈے برساتا جا رہا تھا۔ جیمو کو دو ڈنڈے سر پر اور ایک پسلیوں پر پڑا۔ ایک ناقابل بیان درد اس کے پورے جسم میں پھیل گیا مگر وہ نہ تو اپنی جگہ سے ہلا اور نہ ہی منہ سے کوئی آواز نکالی کیونکہ ردعمل ان وحشیوں کی درندگی کو

مزید مہمیز دیتا تھا' سفر کے دوران کئی بار مرجا اور اس کے ساتھیوں نے بس روک کر یہی کارروائی دہرائی۔

بسیں پرانی اور پھٹیچر تھیں' اس سے پہلے وہ صرف قصبے کی پختہ سڑکوں اور چھوٹے روٹوں پر چلا کرتی تھیں' اب ان کے لئے اتنا بوجھ لے کر چلنا مشکل ہو رہا تھا' ڈرائیوروں نے سرب فوجیوں کے مخصوص نشانات والی وردیاں پہن رکھی تھیں' باہر ایسی گرمی تھی جیسے آسمان سے آگ برس رہی ہو لیکن اندر کا ماحول اس سے بھی برا تھا ڈرائیور جان بوجھ کر وقفے وقفے سے ہیٹر آن کر دیتے جس کی وجہ سے بس کا اندرونی درجہ حرارت کھولاؤ کے نقطے تک پہنچ جاتا' پسینہ قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑوں کو تربتر کرتا ہوا انہیں سر سے پاؤں تک بھگو دیتا اور ٹھہری ہوئی ہوا میں ایک ایسی بدبو پھیل جاتی جس سے دم گھٹنے لگتا تھا' ابھی امتحان کی گھڑیاں ختم نہیں ہوئی تھیں!

بالاخر وہ بنجالوکا پہنچ گئے جو اس علاقے کا سب سے بڑا اور دلکش شہر تھا "یہ سب ہماری کرنی کا پھل ہے" جیمو نے شہر کے مضافات میں جا جیس کی طرف جاتی ہوئی سروس روڈ سے گذرتے ہوئے سوچا' بنجالو کا کبھی ایک بہت چھوٹا اور پرسکون علاقہ ہوا کرتا تھا قدیم ترکی لفظ "شہر" جو آج کل کے ڈاؤن ٹاؤن کا متبادل ہے' اس خوبصورت پرانے شہر کے حسن کا بھرپور ترجمان تھا جو مسلمان آبادی کا علاقہ تھا' 1969ء کے زلزلے کے بعد آسٹریا' ہنگری اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان واقع اس سرحدی شہر کے حسن کی بحالی کے لئے اس کے مکینوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی "تاج کا ہیرا" کہلانے والے اس شہر کے لئے نہ کسی نے خرچ کی پرواہ کی اور نہ محنت سے جی چرایا' خود جیمو بھی رضاکار نوجوانوں کے ان دستوں میں شامل تھا جنھوں نے کھنڈروں کو

دوبارہ شہر کی شکل دی تھی۔ نئے رہائشی فلیٹوں پر مشتمل عمارتیں' سکول اور نرسریاں تعمیر کی گئیں اور بکھری ہوئی راکھ کو ایک جدید اور پرہجوم شہر کی شکل دی گئی جس میں بڑی بڑی شاہراہیں اور باغات تھے۔ اب یہ واقعی "تاج کا ہیرا" کہلانے کے لائق ہے' لوگ کہا کرتے تھے۔

زلزلے کے بعد شہر کی تعمیرنو کے دوران بہت سے نئے لوگ نہ صرف بوسنیا بلکہ اردگرد کی جمہوریتوں سے بھی یہاں آکر آباد ہو گئے۔ ان کے نت نئے رویوں اور گوناگوں رسوم و رواج کے باعث یہ نیا شہر نئی اقدار اور انوکھے مسائل کی آماجگاہ بن گیا۔ اب یہ ایک سرد مہر شہر تھا' کراجینا کی نام نہاد سرب حکومت کا دارالخلافہ۔ وہ جگہ جہاں سے نفاق اور جھگڑے کے متعدی جراثیم پیدا ہوئے اور پھر سارے علاقے میں پھیل گئے' ہزاروں مسلح جنگجو شب و روز اس کی گلیوں میں پھرتے رہتے جو ایک ریاست کے خیال خام کے نام پر کسی کو بھی قتل کر سکتے تھے' ان ہمسایوں اور دوستوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر سکتے تھے جو ابھی چند دن پہلے تک شادیوں میں ان کے "شہ بالے" اور ان کے بچوں کے اصطباغ کے موقع پر "دینی باپ" بنتے تھے۔ ان جنونی سربوں میں ایسے بھی تھے جو اپنے نزدیک ترین رشتہ داروں اور عزیزوں کا لحاظ بھی نہیں کرتے تھے سالے' سالیاں' بہنوئی۔ صدیوں سے آباد خاندان۔ سب کو دیس نکالا مل رہا تھا۔ سیاست کے اس اندھے اور جاہلانہ جنون نے ان کی آنکھوں پر عجب طرح کی پٹیاں باندھ دی تھیں اور پورا علاقہ لاشوں سے بھر گیا تھا۔

کبھی کبھی جیمو کے دماغ میں ایک خیال چپکے سے رستہ بناتا "اگر زلزلہ نہ آتا اور پرانا شہر قائم رہتا تو شاید ....

جب بسیں پرانے شہر سے گذر رہی تھیں تو ایک گارڈ نے ڈرائیور کو آگے کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا' ڈرائیور نے ایک بٹن دبایا اور سسکار آلود شور کے ساتھ دروازہ کھل گیا' گارڈ نے اپنی مشین گن دروازے میں رکھی اور اس کی نال کا رخ قریب آتی ہوئی مسجد کے میناروں کی طرف کر کے تڑاتڑ گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس کے ساتھیوں نے اس عمل پر اظہار مسرت کیا اور اسے مبارکباد دی۔ جیمو نے اپنے آپ سے کہا۔

"آج نہیں تو کل مکافات عمل کا مرحلہ ضرور آئے گا"۔

چہرے سے پھوٹتے ہوئے پسینے کی وجہ سے اسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا' اس نے اپنا جھکا ہوا سر اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اور زیادہ دبا دیا' وہ پہاڑیوں کی طرف جانے والی بڑی سڑک چھوڑ کر ایک پختہ مگر تنگ سی سڑک پر مڑ گئے۔ جلد ہی کولتار کی سڑک کی جگہ گول گول پتھروں نے لے لی اور اس کے بعد کچا اور گرد بھرا راستہ شروع ہو گیا جس پر درختوں سے گھرے ہوئے اس علاقے کی' تمام غلاظت بکھری ہوئی تھی۔ چند میل چلنے کے بعد بسیں پھر رک گئیں۔ فوجی ٹرکوں پر سوار جیالے وحشت اور نفرت بھری آنکھوں کے ساتھ ہاتھوں میں ڈنڈے لئے ہوئے چھلانگیں مارتے نکلے اور بسوں میں پھیل گئے' وہ ایک جنون کے عالم میں قیدیوں کو مارنے چلے جا رہے تھے وہ انہیں بوٹوں سے ٹھوکریں مارتے اور پوچھتے کہ تم میں سے "کوزارک" کے رہنے والے کون کون ہیں ________

جب کوئی نہیں بولا تو وحشی مرجا اپنے لمبے بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ آگے بڑھا اور ایک ایک قیدی کو بالوں سے پکڑ کر ان کے چہروں کو اپنی خون آشام آنکھوں سے گھورنے لگا۔

"اخاہ۔ تو یہ تم ہو۔ میرے کبوتر" اس نے پر ینبیڈور کے ایمیڈس کیفے کے مالک دادو کو بالوں سے پکڑ کر بس کے دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے دادو کو اس قدر زور سے دھکا دیا کہ وہ گرد بھری سڑک پر چاروں شانے چت گر گیا۔ مرجانے ہولسٹر سے پستول نکالتے ہوئے دادو کو اپنے نشانے پر رکھتے ہوئے درختوں کے قریبی جھنڈ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے اسے رکنے اور گھٹنوں کے بل جھکنے کا حکم دیا' دادو نے ایک ایسی خاموشی سے تعمیل کی جیسے وہ اپنی قسمت کے فیصلے پر صابر و شاکر ہو چکا ہو لیکن اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ مرجانے پستول دادو کے سر پر رکھا مگر اس سے پہلے کہ اس کی انگشت شہادت دب کر دادو کا قصہ ختم کر دیتی ایک آواز گونجی۔ "نہیں۔ مرجا نہیں ...... اسے نہ مارو۔ پلیز۔"

مرجانے شدید حیرت کے ساتھ سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا اس کے ساتھیوں میں سے ایک آدمی چیختا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ "اسے نہ مارو .... یہ میرا دوست ہے"۔

مرجا کے چہرے پر ایک کینہ توز مسکراہٹ ابھری جس سے اس کے تمباکو زدہ غلیظ دانت اور بھی نمایاں ہو گئے۔

"یہ واقعی اچھا آدمی ہے' میں اس کی گواہی دیتا ہوں کیونکہ میں اس کے کیفے میں بیرے کی نوکری کر چکا ہوں" مرجا کے ساتھی فوجی نے دادو کو زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے تو تم اسے لے جا سکتے ہو" مرجانے کہا' "تمہارا اس سے جو بھی معاملہ ہو مجھے اس سے غرض نہیں مگر میری ایک بات یاد رکھنا سب

سے اچھا مسلمان وہ ہوتا ہے جو مر چکا ہو"۔

مرجا نے پستول واپس ہولسٹر میں رکھا اور مڑ کر ایک فوجی ٹرک میں سوار ہو گیا۔ دادو اور اس کا سابق ویٹر چند لمحے وہیں کھڑے رہنے کے بعد جب بس میں داخل ہونے لگے تو مرجا نے ٹرک میں پڑی ایک مشین گن کی نال پر لٹکے ہوئے ایک چھوٹے سے پلاسٹک کے مگرمچھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دادو سے کہا۔ "اسے چومو"

دادو نے خاموشی سے آگے بڑھ کر اس کے حکم کی تعمیل کی جس پر ٹرک میں موجود مرجا کے ساتھی دیوانوں کی طرح قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ مرجا نے دادو سے کہا

"اس نے تمہاری جان بچا لی ہے اب جلدی سے بس میں بیٹھ کر شکل گم کرو، اس سے پہلے کہ میرا ارادہ بدل جائے"۔

اس کے بعد غمزدہ خاموشی میں ڈوبا بسوں کا یہ کارواں دوبارہ اپنے دہشت بھرے سفر پر روانہ ہو گیا، گرد بھری کچی سڑک کے اختتام پر دوسری طرف واقع بوٹ کیمپ کے فوجیوں کے ایک بڑے گروپ نے ان کو روکا۔

"آؤ ان حرامزادوں، اپنی ماں کے یاروں کو ختم کر دیں۔ ایک فوجی چلایا۔

"ذرا دیکھو تو ان کتوں کے جسم سے کیسی بو آ رہی ہے" ایک دوسرے فوجی نے ایک لمحے کے لئے بس میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ایک اور فوجی نے اپنی سنگین لگی رائفل بس کے پچھلے دروازے سے یہ جاننے کے لئے اندر گھسیڑ دی کہ یہ کس کو اور کہاں جا کے لگتی ہے؟ قیدیوں کی خوش قسمتی کہ وہ کسی کو نہ لگی وہ خوف کے عالم میں دم سادھے بیٹھے رہے

کہ دیکھیں' آنے والا وقت ان کے لئے کیا نیا ستم ایجاد کرتا ہے!

ایک بے ہنگم سا سپاہی ٹرک سے اتر کر بس میں آیا۔

"کیا تم میں نذیر کراک نامی کوئی آدمی ہے"۔

وہ موٹروں کے ایک مستری کو ڈھونڈ رہا تھا جس کی پرہینڈور میں اپنی ایک چھوٹی سی ورکشاپ تھی' نذیر سمیت بس کے پچھلے حصے میں فرش پر لیٹے ہوئے سب لوگ خاموش رہے' بس کے اندر کی ناقابل برداشت گرمی کے ساتھ ساتھ نذیر اپنی ٹوٹی ہوئی پسلیوں کا شدید درد بھی برداشت کر رہا تھا جو امارسکا کیمپ میں ہونے والی ایک تفتیش کی نشانی تھا' سپاہی چلا گیا مگر چند منٹ بعد پھر آگیا اور بولا۔

"مجھے نذیر کراک چاہئے اور مجھے پتہ ہے کہ وہ اسی بس میں ہے"۔

اس بار بھی کوئی جواب نہ آیا۔ صرف پرانے انجن کی پھٹی ہوئی آواز ہی بس میں گونجتی رہی۔ اس پر وہ طیش میں آگیا اور چلا کر بولا۔

"کیا تم لوگوں نے مجھے الو کا پٹھا سمجھ رکھا ہے .... سب بہرے ہو گئے ہو کیا؟ اگر تم میری آواز سن رہے ہو تو غور سے سنو۔ نذیر کراک کے پاس جواب دینے کے لئے صرف دس سیکنڈ ہیں دوسری صورت میں' میں ایک پورا راؤنڈ بس کے اندر فائر کر دوں گا ...... اپنا نفع نقصان سوچ لو" ابھی وہ لفنگا یہ دھمکی دے ہی رہا تھا کہ کسی طرف سے ایک راؤنڈ فائر ہونے کی آواز سنائی دی۔

"میں یہاں ہوں" نذیر' اس خونی درندے کی دھمکی سے اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"باہر نکلو ماں کے خصم۔ نازیوں کی حرامی اولاد .... تم بھی حرامی ہو اور

تمہارا باپ بھی نطفہء ناتحقیق تھا درخت ہمیشہ اپنے بیج پر ہی جاتا ہے"

"میں اٹھ نہیں سکتا ...... زخمی ہوں ...... مجھ سے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا جاتا" نذیر نے کہا۔

"میری بات سنو ...... گندگی کے ڈھیر' مسلمان فضلے .... باہر نکلو اس سے پہلے کہ میں یہیں شروع ہو جاؤں"۔

سپاہی اپنا دھمکی بھرا جملہ مکمل کئے بغیر پاگلوں کی طرح رستے میں آئی ہوئی ہر چیز کو ٹھوکریں مارتا ہوا بس کے پچھلے حصے کی سمت بڑھا' نذیر نے اپنے اوپر لدھے ہوئے بہت سے انسانی جسموں کے اس ڈھیر میں سے بمشکل خود کو باہر نکالا جن کے مالک دہشت کے سبب اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑے تھے اور مار کھانے کے بعد "سی" تک نہیں کرتے تھے' نذیر لڑکھڑاتا ہوا بس کے دروازے کی طرف بڑھا جس کے باہر فوجی ٹرک والے چار "جیالے" مرجا اور باکن سمیت اس کا انتظار کر رہے تھے انہوں نے نذیر کو الف ننگا کیا اور ماں بہن کی گالیوں کے ساتھ بری طرح مارنا شروع کر دیا انہوں نے چاقوؤں سے کاٹ کر اس کے ماتھے پر لفظ حرامی کی "ح" بنا دی' اس کے بعد ایک فوجی نے نہایت تیز دھار تلوار کے ساتھ اس کے جسم کو نیچے سے اوپر تک دو حصوں میں کاٹ دیا' نذیر کا زخموں سے بھرا جسم چند لمحوں کے لئے کانپا اور اس کے بعد موت کی گونج بھری ایک انتہائی دل ہلا دینے والی آواز کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ فوجیوں نے بس کا سامان رکھنے والا حصہ کھولا اور نذیر کے مردہ جسم کو آلوؤں کی بوری کی طرح اس میں پھینک دیا اور پھر اس اطمینان سے ٹرک میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

وہاں سے منجکا کیمپ کا فاصلہ صرف چند میل کا تھا بسیں جب وہاں

پہنچیں تو شام رات میں ڈھل رہی تھی کیمپ کے گیٹ پر جلی حرفوں میں درج تھا۔

"مازکا ملٹری کیمپ ---- داخلہ منع ہے"۔

امارسکا سے منجکا کیمپ تک کا فاصلہ کہنے کو صرف 35 میل کا تھا مگر یہ چھ گھنٹوں میں طے ہوا' ڈرائیوروں نے گیٹ کے سامنے ایک تنگ اور لمبی قطار میں بسیں پارک کر دیں۔ خبر پھیلی کہ قیدیوں کو رات بسوں میں ہی گذارنا ہوگی کیونکہ اندھیرا ہو جانے کے باعث ان کی صحیح طور سے جانچ پڑتال نہیں ہو سکتی اور کیمپ میں بجلی کا انتظام نہیں ہے' اس وقت تک قیدیوں کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ آنے والی رات ان کے لئے کیا کیا ہولناک مصائب لے کر آ رہی ہے!

سب سے پہلے بسوں کی کھڑکیاں مضبوطی سے بند کرنے کے بعد ہیٹر پوری رفتار سے چلا دیئے گئے' قیدی بھوکے' پیاسے درماندہ تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی مڑی تڑی حالت سے حرکت کر سکتا۔ ان میں سے کچھ نے انتہائی راز داری سے کام لیتے ہوئے سپاہیوں کی نظروں سے چھپ چھپا کر اپنے پسینے سے شرابور پھٹے پرانے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اپنے جھلسے ہوئے ہونٹ تر کر لئے' کچھ دیر کے بعد ڈرائیور آئے انہوں نے بسوں کے انجن اور ہیٹر بند کئے اور چلے گئے' ان کے ساتھ ہی حفاظتی دستے کے لوگ بھی غائب ہو گئے۔ تقریباً دس منٹ تک ایک دہشت بھری خاموشی چھائی رہی جسے جیمو کے بالکل قریب سے ابھرنے والی پہلے بلاوے کی صدا نے توڑا۔

"کیا یہاں ڈیڈو کرنالک نامی کوئی شخص ہے"

اب وہ پر یجیڈور کی ایک معروف عوامی شخصیت' ایک ریستوران کے

مالک اور عمدہ اتھلیٹ' ڈیڈو کے پیچھے تھے جو مقامی بلدیہ کے مختلف عہدوں پر فائز رہ چکا تھا جب وہ بس سے نکل رہا تھا تو ایک ''درندے'' کی آواز سنائی دی جو اسے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

''اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہیمبرگر میں ڈالنے کے لئے گوشت کا قیمہ کس طرح بنایا جاتا ہے''۔

اس کے ساتھ ہی عین بس کے دروازے پر اس نے ایک تیز چاقو ڈیڈو کی کمر میں دور تک گھسا دیا' خون کا فوارہ سا چھوٹا اور دروازے کے قریب موجود تمام قیدی دہشت کی وجہ سے ایک دوسرے سے جڑ سے گئے' وہ ڈیڈو کے خون بہنے اور اس کی سانس کے اکھڑنے کی آوازیں سن رہے تھے اس کا جسم کچھ دیر لرزتا رہا اور پھر چاروں طرف موت کا سناٹا پھیل گیا۔

اس بار خاموشی کا وقفہ ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں تھا فوجیوں نے تین قیدیوں کو ڈیڈو کی لاش واپس بس میں رکھنے کا حکم دیا کوئی آگے نہ بڑھا۔ ایک فوجی بس میں داخل ہوا اور اس نے پہلے تین قیدیوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیا' موت کی دہشت سے بھینچے ہوئے جبڑوں کے ساتھ انہوں نے ڈیڈو کے خون آلود مردہ جسم کو اٹھایا اور باہر سے ملنے والے احکام کے مطابق اسے ایک سیٹ پر ڈال دیا۔ بس کے باہر سے خون آشام درندوں کے تازہ لہو کی خوشبو پانے والی غراہٹوں اور سسکاریوں کی خون سکھا دینے والی آوازیں آ رہی تھیں اور قاتلوں کی آنکھیں ایک انجانی وحشت سے چمک رہی تھیں۔

او خدا ------ یہ ڈراؤنا خواب کب ختم ہو گا؟

جیمو کا سر اس کے سامنے کی سیٹ پر لگے لوہے کے ڈنڈے پر اس کے قینچی کی شکل میں بندھے بازوؤں پر جھکا تھا اگلی سیٹ خالی تھی کیونکہ کوئی بھی

ان وحشی بھیڑیوں جیسے گارڈوں کے قریب بیٹھنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا' سیٹ کے پشتے اور اس پر لگے لوہے کے ڈنڈے کے درمیان تقریباً" ایک انچ کی درز تھی جس سے جیمو بس کے آگے کا حصہ دیکھ سکتا تھا' اس نے ایک فوجی کو لکڑی کے ناتراشیدہ انسانی بازو کے سائز کا ڈنڈا لے کر اٹھتے ہوئے دیکھا' اس منظر کی آخری جھلک میں اس نے فوجی کو اپنی طرف بڑھتے اور ڈنڈے والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی' درد کی ایک تیز اور شدید لہر اس کے وجود میں اٹھی اور اسے ایک آواز سنائی دی ...... یہ مرجا کی آواز تھی جو اس سے کہہ رہا تھا۔

"یہ تمہارے لئے ہے' جیمو...... تاریخ کے پڑھاکو......"

اس کے بعد اس کے سر اور کمر پر پے در پے بہت سی مزید ضربیں لگیں۔ اس نے اپنے سر کو بچانے کے لئے بایاں ہاتھ بلند کیا' مرجا نے ڈنڈا ایک طرف رکھا اور پستول نکال کر اس کی نال جیمو کے ماتھے سے لگاتے ہوئے بولا'

"اب اگر تم نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو میں تمہیں کتے کی موت ماروں گا"

اس کے بعد اس نے جیمو پر پہلے سے بھی زیادہ وحشیانہ انداز میں ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ درد کی شدت سے جیمو کے حواس جواب دینے لگے اس کے سر' چہرے اور گردن پر خون ہی خون تھا جو اس کی پسینے بھری غلیظ قمیض کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔

جیمو نے سر اٹھا کر مرجا کی وحشت بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بولا۔

"تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میں نے تمہار کیا بگاڑا ہے؟"

مرجا اس غیر متوقع سوال سے سٹپٹا سا گیا۔ اس نے جمہ سے آنکھیں چراتے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ بیٹھے پر بیجیڈور ریڈیو کے پروڈیوسر محرم نذیر ووچ کو دیکھا اور وحشیانہ مسرت سے اسے ڈنڈے مارتا ہوا بولا۔

"اوہ میرے ننھے پرندے .... تو یہ تم ہو۔ جس نے محاذ جنگ سے آنے والی خبروں کو نشر کرنے سے انکار کیا تھا! کیا تھا نا؟"

"میں نے ایسا نہیں کیا تھا" محرم نے ڈنڈے کی ضربوں سے بچنے کے لئے اپنا سر سیٹ کی آڑ میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتہ ہے تم نے انکار نہیں کیا تھا' کیونکہ تم ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے .... لیکن تم نے ڈنڈی مارنے کی کوشش ضرور کی تھی اب تمہیں پتہ چلے گا کہ سرب فوجی کیا ہوتے ہیں؟ چلو اٹھو یہاں سے"۔

محرم' بازوؤں سے اپنا چہرے اور سر کو بچاتا ہوا بس سے باہر نکلا لیکن پیٹ پر پڑنے والی ٹھوکر اور کھوپڑی پر لگنے والی کلائی کی زوردار ضرب نے اسے چکرا دیا۔

"بہت ہو گئی ------" بس کے اگلے حصے سے ایک تحکمانہ آواز سنائی دی"

"اس طرح کے کام تم امارسکا کیمپ میں کر سکتے ہو مگر یہاں یہ نہیں ہو گا۔ چھوڑ دو اسے"

بعد میں پتہ چلا کہ منجکا کے کیمپ کمانڈر کی آواز تھی جو اس ساری کارروائی کا نگران اعلیٰ تھا۔

کمانڈر کی آواز سے پیدا ہونے والے لمحاتی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے محرم جلدی سے بس میں واپس آ گیا' ماتھے پر لگنے والے ایک زخم سے

نکلتی ہوئی لہو کی پتلی سی دھار اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی' اس کے بعد ڈرائیور بس میں داخل ہوا' اس نے اندر کی بتیاں بجھا دیں' دروازے بند کئے اور باہر نکل گیا۔

امن اور اندھیرا وقتی طور پر بس میں اتر آئے تھے لیکن دہشت زدہ قیدیوں میں اتنی جرات اور ہمت نہیں تھی کہ سانس بھی بلند آواز میں لے سکتے ان کے جسموں پر ایسا لرزہ طاری تھا جیسے وہاں شدید سردی پڑ رہی ہو۔ بند اور حبس آلود ہوا سے بننے والی گھٹن کی وجہ سے متلی کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی' پیاس کی شدت سے ان کے ہونٹ چیخ رہے تھے کبھی کبھی کوئی بہادر جسموں کے ڈھیر سے ہمت کر کے اٹھتا اور کھڑکی کے شیشوں پر جمی رطوبت پر انگلیاں پھیر کر اکا دکا قطروں سے اپنے ہونٹ نم کرنے کی کوشش کرتا' ان کے حلق ایک انتہائی تکلیف دہ خشکی سے بھر گئے تھے' ایسے میں نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جیمو کے چہرے' بالوں اور گردن پر لگا خون جم کر سوکھنے لگا' تھا اس نے اپنی انگلیوں سے اپنے قیمہ بنے چہرے کو چھو کر دیکھا پھٹا ہوا گوشت ایک غلاف کی سی صورت اختیار کر چکا تھا اور جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سوکھ کر ایک بھربھری مٹی کی شکل میں ڈھل چکے تھے جو ہاتھ لگانے پر بکھرتے اور اس کی گود میں گر جاتے اس کا ہاتھ اور سر مسلسل سوجتے چلے جا رہے تھے۔

علی الصبح تقریباً" پانچ بجے انہیں بسوں کے قریب ہی واقع ایک میدان میں لے جایا گیا' جیمو والی بس سے دو قیدی نیچے نہ اتر سکے کیونکہ وہ مر چکے تھے' محافظوں کے جتھے میں کچھ نئے فوجی شامل ہو چکے تھے' قیدیوں کے نام پکارے جانے لگے اور سو سو کے گروپ کیمپ کے دروازے میں سے اندر

بھیجے جانے لگے' گذشتہ رات کے مقتولوں میں جوزن' باسک' جیما اور ایک نوجوان منجا شامل تھے یوں امارسکا سے منجکا کیمپ تک کے سفر میں کل ملا کر نو انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔

آٹھواں باب

منجکا کیمپ میں سب سے پہلے طبی معائنے کا حکم صادر ہوا' جیمو کی فائل میں مندرجہ ذیل رپورٹ درج ہوئی۔

"دایاں بازو ٹوٹا ہوا' ایک پسلی شکستہ' کھوپڑی کی ٹوٹی ہوئی ہڈی میں جگہ جگہ جریان خون۔ فوری طبی امداد کی ضرورت"۔ طبی معائنے کا سلسلہ دن بھری جاری رہا' قیدی دو دن کے بھوکے تھے لیکن انہیں سوائے پانی کے کچھ نہ ملا' شام کو انہیں قیدی خانوں میں لے جایا گیا جو اصل میں مویشیوں کے خالی باڑے تھے جن کے سیمنٹ کے فرشوں پر پڑی ہوئی گھاس بستر کا کام دے رہی تھی۔

"یہ تمہارے رہنے کی جگہ ہے' اب تم منجکا میں ہو اور میں اس کیمپ کا نگران اعلیٰ ہوں" گارڈوں کے لیڈر نے کہا۔

"جب تک تم یہاں ہو تمہیں کچھ بنیادی اصولوں کی پابندی کرنا ہو گی اور پہلا اصول یہ ہے کہ تمہارے سر خمیدہ اور ہاتھ کمر کے پیچھے ہونے چاہئیں' تمہیں کام حکم اور قاعدے کی پابندی کرنا ہو گی اگر تم ایسا کرو گے تو کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔

بعد میں قیدیوں کو معلوم ہوا کہ اس نگران اعلیٰ کا نام سپاگا تھا اور وہ واقعی قیدیوں سے ہمدردی رکھتا تھا' اس بات کی تصدیق ان قیدیوں نے بھی کی جو مہینوں سے اس کیمپ میں بند تھے' منجکا کیمپ کے قیدی سنسکی موست' کلجوک' ڈوبوج' بوسانکا ڈوبیکا' گلے موک' پریجیڈور اور اردگرد کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کل ملا کر وہاں تقریباً" چار ہزار قیدی تھے جو چھ

باڑوں میں رکھے گئے تھے جنہیں سپاگا' پیولین کہہ کر پکارتا تھا' ایک بلاک تین باڑوں پر مشتمل تھا جس کے ساتھ تھوڑا سا مزید تعمیر شدہ علاقہ تھا جہاں مطبخ اور طعام خانہ واقع تھے' ہر یونٹ خار دار تاروں کے دو حلقوں سے محفوظ بنایا گیا تھا جن کے درمیان ایک بارودی سرنگ تھی۔ لکڑی کے تختے پر سیری لک رسم الخط میں لکھا ہوا لفظ "بارودی سرنگیں" خاردار تار کے ساتھ لٹکایا گیا تھا' ہر طرف مشین گنوں سے لیس محافظ اپنے حفاظت خانوں کے باہر کھڑے نظر آتے تھے' ان کے ساتھ تربیت یافتہ کتے تھے' محافظوں کی کیمو فلاج وردیوں کے مخصوص انداز کی وجہ سے قیدی انہیں "پائیڈ پائپرز" کہہ کر بلاتے تھے۔

قیدی خصوصی اجازت نامے کے بغیر (جس کا حصول آسان نہیں تھا) ایک سے دوسرے بلاک میں نہیں جا سکتے تھے' وہ باورچی خانے میں کام کرتے' انہیں دن میں دو بار کھانا ملتا تھا' صبح چھ بجے کے لگ بھگ ناشتہ اور سہ پہر تین بجے لنچ۔ ابتدائی دنوں میں کھانے کا معیار امارسکا کیمپ جیسا ہی گھٹیا اور فضول تھا۔ کچھ دن بعد عالمی صلیب احمر (ریڈ کراس) کے نمائندوں کا آنا جانا شروع ہو گیا اور قیدیوں کو ان کی لائی ہوئی خوراک بھی ملنے لگی جس کا معیار بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ قیدیوں کی زندگی انہی دو کھانوں کے اوقات سے بندھ چکی تھی جنہیں وہ مکمل خاموشی کے ساتھ کھاتے تھے' درماندہ اور تھکے ہوئے جسموں کے ساتھ جب وہ سایوں کی طرح اپنے اپنے باڑے سے کھانے کے لئے نکلتے تو ان کے قدم بے ترتیبی سے اٹھتے اور لنچ کے انتظار میں قطاروں میں کھڑے کھڑے ان کی ٹانگیں کمزوری کی وجہ سے جواب دے جاتیں اور ان میں سے کئی چکرا کر قریب کھڑے لوگوں کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتے جو بدستور کھانے میں مصروف رہتے' ان افتادگان کو ہوش میں لانے کے

لئے ان پر پانی ڈالا جاتا اور ہوش میں آنے کے بعد وہ اس طرح اپنا کھانا کھانے میں جت جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا' بعض اوقات وہ پلیٹوں کو زبان سے چاٹ کر اس طرح صاف کرتے کہ خوراک کا ایک ایک ذرہ ان کے معدوں میں پہنچ جائے۔

ایک دن ووجو کیوپرسنان' جو اس سارے المیے کے مرکزی کرداروں میں سے ایک تھا کیمپ کے دورے پر آیا اس نے بتایا کہ وہ بہت جلد اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے اور یہ کہ سرب' مسلمان اور کروٹ (کروشین) پہلے کی طرح مل جل کر بوسنیا ہرزیگووینا میں رہا کریں گے کہ یہ ان کا مشترکہ گھر ہے' اس نے اس موضوع پر بہت لمبی تقریر کی جس کے دوران قیدی اعتبار اور بے اعتباری کی ملی جلی فضا میں تالیاں بجا کر اسے داد دیتے رہے۔

ایسی ہی موہوم امیدوں کے سائے میں وقت گذرتا گیا' ایک وقت میں صرف تیس قیدیوں کو اپنے زندانی باڑے سے نکل کر آدھا گھنٹہ گھاس پر گذارنے کی اجازت ملتی تھی۔ جیمو کے باڑے کا انچارج ثاقب بیسک نامی ایک فوجی تھا جسے سب نے لیفٹیننٹ کرنل کا نام دے رکھا تھا' اس کے معاونین سیمسو ہالی لیجک اور فیو فاضلک تھے' یہ تینوں مل کر اس باڑے کے نظم و ضبط کے ذمہ دار تھے۔

زخمی قیدی درد سے کراہتے رہتے لیکن ان کی روحوں پر لگنے والے زخم ان جسمانی زخموں سے کہیں زیادہ گہرے اور تکلیف دہ تھے' تشویش اور تکلیف کا تاثر ان کی آنکھوں میں جم سا گیا تھا' جوں جوں کیمپ پر شام کے سائے لمبے ہوتے اداسی اور مایوسی اور زیادہ بڑھ جاتی' پہاڑی کے دامن میں واقع اس کم آباد اجنبی سے علاقے میں راتیں سرد اور بارش بھری تھیں۔ گرج

چمک سے آسمان ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا' بجلی کی اچانک چمک سے باڑے میں گھاس اور پرال کے ڈھیروں پر پڑے قیدیوں کے مڑے تڑے جسم ایک لمحے کے لئے روشن ہو جاتے۔ صبحدم بارش رک جاتی اور بادل بکھر جاتے۔ باورچی خانے کی ڈیوٹی والے قیدی ناشتہ تیار کرنے کے لئے صبح کاذب کے وقت تین بجے کے قریب اٹھ جاتے' باقی قیدی پانچ بجے جگائے جاتے اور اگر پانی موجود ہوتا تو نہا دھو لیتے' اس کے بعد وہ اپنے اپنے باڑے میں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے' سر جھکائے' قطاروں میں کھڑے ہو جاتے اور دو دو کر کے ناشتے کے لئے جاتے۔

منجکا کیمپ میں سب سے بڑا مسئلہ پانی کا تھا۔ پینے کا پانی فوجی ٹرکوں میں چند میل دور واقع ایک کنوئیں سے لایا جاتا پھر اسے پلاسٹک کے بڑے بڑے مٹکا نما برتنوں میں ڈال کر ہر باڑے کے سامنے لکڑی کی میزوں پر رکھ دیا جاتا' جہاں سے ایک چھوٹا کنستر بھرنے کے بعد قیدیوں میں سے ایک اسے دستے سے پکڑ کر اٹھاتا اور دوسرا اس سے پلاسٹک کا ایک چھوٹا کپ بھر بھر کر باری باری تمام قیدیوں کو پانی پلاتا جاتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد ریڈ کراس والوں نے قیدیوں میں پلاسٹک کی بنی ہوئی پانی کی بوتلیں تقسیم کیں' اس سے یہ آسانی ہو گئی کہ اب قیدی قطار میں لگ کر بڑے مٹکے میں سے خود اپنے لئے پانی لے سکتے تھے' کچھ دنوں بعد کیمپ کے نگران افسروں نے اعلان کیا کہ ڈیزل کی کمی کی وجہ سے ان کے لئے کنوئیں سے پانی لانا ممکن نہیں رہا' اس کے بعد سے فوجی پہرے میں ایک وقت میں دو سو قیدیوں کو پانی پلانے کے لئے قریبی جھیل پر لے جایا جانے لگا جس کو خشکی اور تری پر بیک وقت کام دے سکنے والے ٹینکوں کی مدد سے زیر آب تربیتی

مشقوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

جھیل کا پانی گندا اور کیچڑ بھرا تھا جس میں درختوں کی شاخیں اور سبز جڑی بوٹیاں تیرتی پھرتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک گارڈ قیدیوں کے ایک گروہ کو پانی پلانے کی لئے جھیل پر لایا تو اس نے ان کے سامنے جھیل میں پیشاب کرنے کے بعد انہیں بوتلوں میں پانی بھرنے کا حکم دیا۔ کھانا پکانے کے لئے بھی وہی پانی استعمال ہوتا تھا' جب ریڈ کراس کے نمائندوں نے اس جھیل سے پانی کا نمونہ لے کر ٹیسٹ کیا تو ان کی رپورٹ تھی کہ یہ پانی جانوروں کے پینے کے بھی قابل نہیں ہے۔ ان کی طرف سے کیمپ کی انتظامیہ کو کنوئیں سے پانی لانے کے لئے فاضل ڈیزل فراہم کیا گیا مگر صرف دو بار ٹرک مطلوبہ پانی لے کر آئے اور اس کے بعد پھر سے قیدیوں کے دن میں دوبار جھیل پر جا کر پانی کی بوتلیں بھرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب بارش ہوتی تو قیدی پینے کے صاف پانی کے لئے اپنے پلاسٹک کے پیالے پرنالوں کے نیچے رکھ کر بھر لیتے' اسی بارش میں وہ نہا بھی لیتے کیونکہ کیمپ والوں نے صرف ایک بار ان کے نہانے کا انتظام کیا تھا' سو دنوں میں ایک بار بیس قیدیوں کو گروپوں کی شکل میں دو منٹ کے لئے اپنا جسم گیلا کرنے کی اجازت ملی تھی۔ عالمی ریڈ کراس کے نمائندے اپنے ساتھ سفید رنگ کا پاؤڈر اور شیمپو لائے جس سے تمام قیدیوں کو بالاخر جوؤں سے نجات ملی وہ لوگ ہر بدھ کو اور کبھی کبھار اس کے علاوہ بھی آیا کرتے تھے۔

پہلی بار آتے ہی انہوں نے تمام قیدیوں کے نام درج کئے اور اس کے بعد انہیں ایسے رجسٹریشن کارڈ دیئے جن پر ان کے پہلے اور آخری نام درج تھے' انہیں بتایا گیا کہ ان کے نام اور تمام متعلقہ کوائف جنیوا کے مرکزی

کمپیوٹرز میں محفوظ کر لئے گئے ہیں اور ریڈ کراس والوں کے پاس ہر قیدی کے بارے میں مکمل اور تازہ ترین اطلاعات موجود رہتی ہیں جیمو کا نمبر 00207817 تھا۔

ہر دوسرے بدھ وار کو فی قیدی ایک سگرٹوں کی ڈبی ملتی جو کہ منجکا کیمپ میں ان کی قیمتی ترین متاع ہوتی تھی' دو سگرٹوں کے بدلے قیدی کو ایک اضافی لنچ مل سکتا تھا' دس سگرٹوں سے ایک قمیض خریدی جا سکتی تھی' عام جوتے (جو ریڈ کراس ہی کی طرف سے فراہم کئے جاتے تھے) اس سے قدرے مہنگے تھے' اچھے جوڑے کے لئے بعض اوقات کئی کئی ڈبیاں خرچ کرنا پڑ جاتی تھیں' معمولی سے معمولی چیز کی بھی حفاظت کی جاتی تھی' یہاں تک کے بوٹوں کے ڈبوں کو کاٹ کر تاش کے پتے بنا لئے جاتے تھے نزاد مسلمووچ اس کام کا ماہر تھا۔

عام طور پر کچھ سادہ کھیل شوقیہ بنیادوں پر کھیلے جاتے مگر تاش کے زیادہ رسیا' سگرٹوں کی شرطیں لگا کر جوا بھی کھیلتے تھے۔ سگرٹوں کے بڑے ڈبوں سے حاصل شدہ موٹے گتے سے شطرنج کی بساطیں بنائی جاتیں' مہرے بھی انہی گتے کے ٹکڑوں پر مختلف نقش بنا کر تراش لئے جاتے' شطرنج اور تاش کے یہ دونوں کھیل صرف اس وقت کھیلے جاتے جب پائیڈ پائپر گارڈوں کے باڑے میں آنے کا وقت یا احتمال نہ ہوتا۔ شطرنج کا بہترین کھلاڑی پریجیڈور کا مشہور زلف تراش رفیق سیسک تھا' جس کے بارے میں ایک وقت میں غلط افواہ پھیل گئی تھی کہ وہ شہر پر ہونے والے ابتدائی حملے میں مارا گیا ہے۔ ایک قیدی نے لکڑی کے ٹکڑوں کی تراش خراش کر کے شطرنج کے مہرے تیار کر لئے تھے' اس نے کنٹین سے ایک چمچہ چرا کر اسے توڑا اور پھر اس کے دستے کو

سیمنٹ پر رگڑ رگڑ کر اتنا تیز اور نوکدار بنا لیا کہ وہ ایک باقاعدہ اوزار کی شکل اختیار کر گیا' اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی اس اوزار کی مدد سے سگرٹ ہولڈر' چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز اور انسانوں کی ایسی مورتیاں بنائیں جن کے سر خمیدہ اور ہاتھ کمر کے پیچھے تھے۔

جیمو کے گروپ کی آمد کے پندرہ دن بعد امارسکا کیمپ میں پیچھے رہ جانے والے باقی 184 قیدی بھی منجکا منتقل کر دیئے گئے۔ خوراک کے معیار اور مقدار دونوں میں بہتری ہو رہی تھی اور کبھی کبھار انہیں سیب اور سنگترے کی شکل میں پھل بھی ملنے لگا تھا' ان کے چہروں کی کھردری اور ڈھلکتی ہوئی جلد میں چمک اور سختی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور آنکھوں میں امید کا شعلہ لو دینے لگا تھا یہاں تک کہ کبھی کبھار کوئی بھولی بھٹکی مسکراہٹ بھی ان کے چہروں پر لمحہ بھر کے لئے ہی سہی' جھلکنا شروع ہو گئی تھی۔

خاردار تاروں اور بارودی سرنگوں میں گھرے ہوئے دن بہت سست روی سے گذر رہے تھے۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا' یہ ایک انتظار آلود زندگی تھی' ایک اعصاب شکن کشمکش سے بوجھل ایسی زندگی جس میں کبھی کبھی ان کی روحوں میں بکھرتی ہوئی امید کی کرن آنسو بن کر ان کی آنکھوں میں لرز اٹھتی تھی۔ فی الوقت وہ ناامیدی کے تاریک گڑھے میں سایوں کی طرح جی رہے تھے جو خاردار تاروں اور بارودی سرنگوں کے اس جادوئی حصار میں ایک بے رنگ سی یکسانیت کا مظہر تھا۔ صبح پانچ بجے اٹھنا۔ چھ بجے ناشتہ' باڑے میں واپسی' تین بجے سہ پہر کھانا' ہر دوسرے دن آدھ گھنٹے کے لئے کھلے میدان میں رہنا۔ پھر وہی سورج کا غروب اور وہی شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی -----!!

منجکا کا ماحول ایک ایسی بوجھل افسردگی سے بھرا رہتا تھا جس میں

ایک مرطوب سی بو رچ بس گئی تھی' کچھ ایسی بے یقینی کا عالم تھا کہ پہاڑیاں تک آپس میں سازش کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ رات کی سیاہی میں ہوا اتنی بھاری ہو جاتی جیسے اسے چاقو سے کاٹا جا سکتا ہو' پرندے اس قدر بلندی پر اڑتے کہ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تک سنائی نہ دیتی تھی کیونکہ زمین پر دور دور تک نہ تو کوئی پہاڑی چشمہ تھا اور نہ ہی کوئی گھنا سایہ جو انہیں سورج کی تمازت سے بچا سکتا۔ نہ وہاں کی پہاڑیوں میں کوئی پہاڑیوں والی بات تھی اور نہ ہی آدمی' آدمی لگتے تھے۔

جیمو چھ نمبر باڑے میں تھا' اس کے پرانے ہمسائے اور دوست فتکو اور رمیض یہاں بھی اس کے ہمسائے تھے جبکہ محرم اور سائل سامنے والے حصے میں تھے جس کا درمیانی فاصلہ ایک فٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا فتکو اور رمیض باورچی خانے میں کام کرتے تھے اور گاہے بگاہے وہاں سے جیمو کے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ اڑا لاتے تھے جیمو اس مال غنیمت میں محرم اور سائل کو شریک کرنا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ مرسل کی ڈیوٹی بھی باورچی خانے میں تھی جب کھانا تقسیم ہوتا تو وہ کفگیر سے ان کی پلیٹوں میں مقرر کردہ راشن سے قدرے کچھ زیادہ خوراک ڈال دیتا اور جب ڈبل روٹی کے سلائیس کٹتے تو وہ کناروں کے فاضل ٹکڑے جمع کر کے انہیں شوربے میں ڈال دیتا اور یوں اپنے ساتھیوں کی بھوک کم کرنے کی کوشش کرتا۔

آخری مہینے میں خوراک مزید بہتر ہو گئی' ناشتے میں انہیں دودھ یا چائے کا کپ اور روٹی کا چوتھا حصہ اور مچھلی کا ایک چھوٹا سربند ڈبہ ملنے لگا' دوپہر کے کھانے میں روٹی کے چوتھائی حصے کے ساتھ شوربہ' مٹر' دال اور آلو اور کبھی کبھار گوشت کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا۔ دن چھوٹے ہونے لگے اور سہ پہر

کے ابتدائی حصے میں ہی سورج سب سے اونچی پہاڑی کی اوٹ میں سر چھپانے لگتا جس پر ایک بہت بڑا سرنیمن جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پہاڑی علاقے کی یخ کر دینے والی ہوا چپکے سے باڑے میں داخل ہو جاتی اور درجہ حرارت یک دم ناقابل برداشت حد تک گر جاتا۔ وسط گرما کے یہ مخصوص دن تو کسی نہ کسی طرح گذر جاتے مگر لمبی راتیں کاٹے نہیں کٹتی تھیں۔

جیمو کا زیادہ تر وقت محرم کے ساتھ شطرنج کھیلتے کٹتا جس کا تختہ اور مہرے اس نے نزاد کے ساتھ مل کر بنائے تھے' سیسک بھی کھیل میں شامل ہو جاتا لیکن اس میں سپورٹس مین سپرٹ کا فقدان تھا چنانچہ ہار برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ اکثر ناراض ہو جایا کرتا تھا' کبھی کبھی جیمو اکیلا بیٹھا سوچوں میں گم ہو جاتا اور چھت کے کسی دور افتادہ گوشے کو خالی خالی نظروں سے گھورتا رہتا' اس کے زرد چہرے پر اداسی کی گہری تہہ جم جاتی' وہ دائیں ہاتھ سے اپنے ٹوٹے ہوئے بائیں ہاتھ پر بندھی گندی پٹی کو پھر سے ٹھیک کر کے باندھتا اور جیب سے اپنے بیٹوں کی تصویر نکال کر دیکھنے لگتا جو اس کی بیوی ایلما نے امارسکا کیمپ کے قیام کے دنوں میں اسے بھجوائی تھی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے' چند دن قبل اسے ریڈ کراس کی معرفت اپنی بیوی کا خط ملا تھا اس نے لکھا تھا۔

"مجھے پتہ ہے کہ امارسکا کیمپ اور منجکا جاتے ہوئے تم پر کیا بیت چکی ہے میری جان' تمہیں ہمارے لئے اور خاص طور پر اپنے بیٹے ڈیلی کے لئے ان سب آزمائشوں کو برداشت کرنا ہے' میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ تمہاری جدائی کو اس قدر محسوس کرے گا' وہ اٹھتے بیٹھتے تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے' جب ہم کھانے کے لئے بیٹھتے ہیں وہ اپنے ساتھ والی خالی

کرسی کے سامنے میز پر پلیٹ اور کانٹا چھری وغیرہ سجا کر کہتا ہے "یہ میرے ابا کے لئے ہے" اس کی ایسی ذہنی حالت کے ساتھ روزانہ سارا دن گذرنا آسان نہیں لیکن ایک نہ ایک دن تو امتحان کی یہ گھڑیاں ختم ہوں گی۔ انہیں ہونا پڑے گا۔ ڈینی تمہارے خط بلند آواز میں پڑھ کر ہمیں سناتا اور رلاتا ہے وہ مجھ سے بار بار کہہ رہا ہے کہ میں تمہیں کہوں کہ یکم اکتوبر کو ٹھیک ایک بجے۔ جو اس کی پیدائش کا دن اور وقت ہے تم اس کی تصویر کو بوسہ دینا' یہ اس کے لئے تمہاری طرف سے سالگرہ کا تحفہ ہو گا اور وہ جواباً" تمہاری تصویر کو پیار کرے گا۔

آج اس نے مجھ سے کہا "ماں" مجھے ریڈ کراس والوں کے پاس لے چلو' میں ان سے کہوں گا کہ وہ میری ملاقات میرے باپ سے کرا دیں اور اگر ایک بار انہوں نے ایسا کر دیا تو پھر تقدیر بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکے گی"۔

وہ ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتا جس کی وجہ سے اس کا وزن کم ہو رہا ہے' وہ صرف اس وقت تھوڑا سا کھاتا ہے جب میں اسے تمہارا واسطہ دیتی ہوں آج میں نے اس کے کمرے میں ایک خط دیکھا جو اس نے بنجالو کاٹی وی کے لئے لکھ رکھا ہے' یہ تحریر اس کی عمر سے بڑی سوچ کی آئینہ دار ہے میں اس کے چند جملے مثال کے طور پر نقل کر رہی ہوں۔

"جو کوئی بھی مجھے میرے باپ سے رابطے میں مدد دے سکتا ہو یا اس کو واپس لا سکتا ہو برائے خدا' آگے آئے اور میری مدد کرے' میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے باپ کا اس احمقانہ جنگ' ان ہتھیاروں اور اس سیاست سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے"۔

گھر کی تلاشی کے دوران اس نے تلاشی لینے والوں سے بار بار التجا کی' انہیں ساری بات بتانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں اور خوف سے بھری ہوئی تھیں۔ ہم لوگ عنقریب پر ییڈور چھوڑ جائیں گے' مجبوری ہے۔ اب ہمارے لئے مزید یہاں رہنا ممکن نہیں رہا' ہر روز لوگ تفتیش کے لئے لے جائے جاتے ہیں اور پھر ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مجھے اری کی فکر رہتی ہے کیونکہ اب وہ جوان ہو چکا ہے اور سب سے زیادہ پکڑ دھکڑ جوانوں کی ہی ہوتی ہے۔ ہم جا رہے ہیں بغیر کسی منزل کی تعین کے۔ اب تمہارے بھائی توفیق کے ذریعے ہمارا تمہارا رابطہ رہے گا۔

ایلما' ڈینی اور اری کی طرف سے تمہیں بہت بہت پیار

جیمو نے یہ خط کوئی سوویں بار پڑھا اور ایک بار پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے حلق میں کوئی گولہ سا پھنس گیا ہو' اس کا سانس رکنے لگا اور درد کی ایک لہر اسے چیخنے پر مجبور کرنے لگی۔ ریڈ کراس کے ذریعے مہینے میں ایک بار قیدیوں کے لئے ان کے لواحقین کے پیغامات آتے جو کیمپ کی انتظامیہ کے سپرد کر دیئے جاتے' جہاں تقریباً" دس دن تک ان کی سنسر کے حوالے سے جانچ پڑتال کی جاتی' اس طرح قیدیوں کو اپنے بھیجے ہوئے خطوں کے جواب کے لئے بھی مہینہ بھر انتظار کرنا پڑتا۔ خطوط کی تقسیم کے دن سب قیدی ایک جگہ جمع ہو کر انتہائی توجہ سے پکارنے جانے والے نام سنتے اور جس کا نام لیا جاتا اس کا چہرہ یک دم کھل اٹھتا' باقی لوگ خاموشی سے "اگلی بار" کی امید کرتے ہوئے اپنے زندانوں کو لوٹ جاتے' گذشتہ روز کچھ لوگوں کے لئے پیغامات آئے جن میں آصف اور ڈاکٹر ایسو صادقووچ بھی شامل تھے' ایسو کی بیوی سیکا نے لکھا تھا۔

"ایسو ..... اگر تم اس آسمان تلے کہیں زندہ ہو تو ہمیں اطلاع دو ...... تمہارے گھر والے تمہارے منتظر ہیں" یہ اور آصف کے گھر سے آنے والا پیغام نامعلوم وجوہات کی بنا پر لوٹا دیئے گئے' خدا جانے اب ان کے پیاروں کو ان کی تلاش میں اور کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا!!

جیمو نے ایری اور ڈینی کی تصویروں کو بھیگتی ہوئی آنکھوں سے ایک بار پھر دیکھا' اپنے چہرے کو گندی اور میلی آستین سے صاف کیا اور ایک بار پھر خط پڑھنے لگا "ٹھیک ایک بجے" آج یکم اکتوبر تھا' ڈینی کی سالگرہ کا دن۔ اب سے تقریباً آدھ گھنٹہ بعد ٹھیک ایک بجے وہ گیارہ سال کا ہو جائے گا اور یہ پہلا موقع ہو گا جب سالگرہ کے دن اس کا باپ اس کے پاس نہیں ہو گا۔ یہ سوچ کر ایک بار پھر آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے محرم اس کے پاس آیا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"مجھے پتہ ہے میرے دوست کہ ایسے میں برداشت کتنی دشوار ہو جاتی ہے لیکن ہمیں بہرحال اس اذیت کے عمل سے گذرنا ہے' جھجکو نہیں' رونا چاہتے ہو تو کھل کر رو لو' اس سے طبیعت ہلکی ہو جائے گی' تم اپنے بیٹے کا سوچ کر رو رہے ہو' میری طرف دیکھو میں بھی آبدیدہ ہوں .... تمہیں اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ تمہارا بیٹا تم پر فخر کرتا ہے' اسے اچھی طرح پتہ ہے کہ تم بے گناہ ہو اور تم نے کوئی جرم نہیں کیا"۔

محرم کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں' اس نے جیمو کے کندھے کو محبت سے تھپکا۔ لفظ اس کے خشک ہونٹوں سے آبشار کی طرح پھوٹ رہے تھے۔

ٹھیک ایک بجے جیمو نے اس چھوٹی سی تصویر کو دیکھا اور چوما' اس کے گلے میں پھر کوئی چیز پھنسنے لگی تھی' اس نے فرش سے تھوڑی سی خشک شدہ

گھاس اٹھا کر اسے مسلا پھر ایک اخباری کاغذ میں رکھ کر اسے آگ لگا دی' بہت دیر تک جلتی ہوئی گھاس سے اٹھنے والے مرغولوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے ماضی کی بنتی بگڑتی یادوں میں ڈینی کی تصویر کو دوبارہ دیکھا' گذری ہوئی سالگرہوں کے منظر اس کی آنکھوں میں پھیلنے لگے۔ میز پر رکھا ہوا بڑا سا کیک۔ آرائشی موم بتیاں' مشروبات سے بھرے جام تازہ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو ...... دوستوں کا اجتماع .... موسیقی ....

بے شمار بے نام خواہشیں اور یادیں اس کے ذہن کی سکرین پر فلم کی طرح چلنے لگیں۔

دن بہت آہستگی سے گذر رہا تھا' شام کی شفق آلود روشنی باڑے کی لکڑی کی دیواروں کے رخنوں سے چھن کر اس کے چہرے پر طرح طرح کے رنگ بکھیر رہی تھی' جیمو کو اپنے ساتھی چلتے پھرتے سایوں کی طرح لگ رہے تھے جن کے دماغوں کے بہت دور دراز گوشوں میں گذرتے ہوئے دنوں کی گنتی اور جمع تفریق کا ایک پراسرار عمل جاری تھا' انہوں نے اپنے کمبلوں میں سوراخ کر کے انہیں اپنے کندھوں پر لبادوں کی طرح ڈال رکھا تھا' دنیا میں کہیں بھی رات انسانوں کو اپنے جال میں اس قدر خاموشی سے نہیں جکڑتی جیسے پہاڑی علاقوں میں ہوتا ہے' دراز ہوتے ہوئے سائے ایک پل میں گہری اور گھمبیر خاموشی میں بدل جاتے ہیں۔ لوگ سردی سے بچنے کے لئے ایک دوسرے سے جڑ جاتے اور اپنے مخصوص نشانوں والے کمبل مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لیتے' ہوا دیوار کے رخنوں سے نکل کر تیل سے جلنے والے واحد اور چھوٹی سی لالٹین کے شعلے کو اس طرح اونچا نیچا کرتی کہ بعض اوقات وہ بالکل بجھنے کے نزدیک ہو جاتا' چھت پر لگے پلاسٹک شیٹوں کے اکھڑے

ہوئے ٹکڑے ہوا سے بجتے رہتے اور بہت کم دروازے کے قریب کوئی سایہ حرکت کرتا نظر آتا۔

رات کے وقت رفع حاجت کے لئے ایک بڑے سے ٹین کے ڈرم کو بیچ میں سے کاٹ کر آدھا کر لیا گیا تھا' قیدی اپنی بیمار اور زخمی انتڑیوں پر پڑنے والے دباؤ سے نجات اور فراغت کے لئے اسے استعمال کرتے جبکہ ان کے ساتھی صرف چند فٹ کے فاصلے پر سو رہے ہوتے تھے' ایک ناقابل برداشت سرانڈ باڑے کی ہوا میں ہمہ وقت موجود رہتی' کچھ قیدی اپنے کمبل نما لبادوں میں مزید سمٹ کر اپنے سر بھی انہیں میں چھپا لیتے تھے' کچھ لوگ جلدی سو جاتے اور تمام رات طرح طرح کے خراٹے نشر کرتے رہتے اور کچھ نیند کے انتظار میں رات رات بھر جاگتے رہتے۔

پھر بارش شروع ہو جاتی اور اس کے ساتھ ہی دیوار کے سوراخوں کے راستے درجنوں جنگلی چوہے اندر آ جاتے جو کبھی چھت کے ابھرے ہوئے بھر بھرے سیمنٹ کو کھرچتے اور کبھی ان کے کمبلوں کے اوپر بھاگتے دوڑتے' یہاں تک کہ ان کے اندر بھی گھس جاتے ایک دفعہ جب فنکو نے اپنے بسکٹوں کے ڈبے میں ایک چوہے کو دیکھا تو اس نے اسے پکڑا اور رمیض کو ڈرانے کے لئے اس کے کمبل کے نیچے پرالی کے ڈھیر میں چھوڑ دیا۔ گلیمک کے حلیل کو ایک بل سے چار نومولود چوہے کے بچے ملے جن کی ابھی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں اور کھال بھی نامکمل تھی' بہت سے قیدیوں کو منجکا کے اس کیمپ کے قیام کی وجہ سے پہلی بار پتہ چلا کہ چوہا کسی دیوار پر سیدھا اوپر بھی چڑھ سکتا ہے' قیدی ان چوہوں کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اکثر اوقات وہ خوراک کے بچے کھچے بھورے ان کے لئے علیحدہ ایک طرف کر کے رکھ

دیتے، کچھ لوگ راتوں کو سردی کی وجہ سے جاگ جاتے اور کمبلوں کو اچھی طرح جسموں کے گرد لپیٹ کر ہاتھوں کو گرم کرنے کے لئے بار بار تیزی سے مسلتے ہوئے باڑے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کچھ دیر تیز تیز چلتے اور پھر واپس رینگتے ہوئے اپنے پرالی کے بستر میں گھس جاتے' ڈیوٹی پر مامور محافظ انہیں پانچ بجے جگا دیتے' وہ رات بھر بند رہنے والے دروازوں کی کنڈیاں کھولتے اور دس دس کے گروپوں میں انہیں ٹائلٹ کی طرف لے جاتے یہ ٹائلٹ دراصل دو دس فٹ لمبے لکڑی کے مضبوط تختے تھے جنہیں ایک خندق نما گڑھا کھود کر اس کے اوپر لٹا دیا جاتا تھا اور ان کے اوپر ایسبٹاس کی چند ٹائلوں سے چھت نما سی چیز بنا دی جاتی تھی منجکا کیمپ کے قیام کے دوران قیدیوں کو ہر دو ہفتے بعد ایک نیا گڑھا کھودنا پڑتا تھا جس پر یہ کام چلاؤ قسم کا عارضی بیت الخلا دوبارہ تعمیر ہو جاتا۔ گڑھے کی کھدائی میں استعمال ہونے والے بیلچے اور کدالیں ہر رات کو انتظامیہ کے دفتر میں واپس جمع کرا دیئے جاتے۔ بالکل یہی اصول باورچیوں کے استعمال کے چاقوؤں کے ساتھ بھی برتا جاتا تھا۔

عقیل رتی

محمد سجاد بھٹی

سیف الملوک عباسی

نواں باب

ایک بل کھاتی ہوئی پکی سڑک باورچی خانے کے دائیں طرف سے گذرتی ہوئی بنجالوکا کی طرف جاتی تھی' کھانا کھانے کے دوران قیدی بار بار حسرت بھری نظریں اٹھا کر اس سڑک کی طرف اس طرح دیکھتے رہتے جیسے انہیں ادھر سے کسی خوش خبری کی توقع ہو۔ یہ سڑک کیمپ تک آکر ختم ہو جاتی تھی' تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کے ایک موڑ کے قریب ایک لمبی چمنی زمین پر سر اٹھائے کھڑی تھی۔ کیمپ میں کسی کی آمد سے پہلے قیدیوں کو چمنی کے قریب ایک گرد کا بادل اٹھتا نظر آتا تھا جس کے بعد وہ پہاڑی موڑوں میں چھپتی اور نکلتی ان کاروں اور ٹرکوں کو اپنی طرف آتا دیکھ پاتے۔ کچھ ہی دیر میں ان کے انجنوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگتیں۔ عام طور پر یہ ریڈ کراس یا کیمپ کے افسروں کی گاڑیاں ہوتیں' جب سپلائی کے ٹرک آتے تو گرد کے بادل کا حجم اور زیادہ بڑھ جاتا۔

"وہ دن کب آئے گا جب وہاں ہمیں کیمپ سے باہر لے جانے والی بسیں' گرد اڑائیں گی ____"

رائف ذوکانووچ نے باورچی خانے میں سے حسرت بھری نظروں سے سڑک کو گھورتے ہوئے ایک لمبی آہ بھر کر کہا!

"ابھی وہ دن بہت دور ہے" راشن کی لائن میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے' محرم نے جواب دیا۔

"اتنے قنوطی نہ بنو محرم' میں نہیں سمجھتا کہ ہم سرما کی شدت کے دنوں تک یہاں رہیں گے"۔

جیمو کو اپنی اس بات کی تائید کی امید افزا باز گشت چاروں طرف سے آتی ہوئی سنائی دی۔

"ہم سرما بھی دیکھیں گے اور اس کے بعد کا موسم بہار بھی"

اس پر کوزارک کے باسی ایسو نے' جو محرم کے بالکل پیچھے کھڑا تھا' لقمہ دیا ---

"مجھے شبہ ہے کہ ہم بہت زیادہ دیر یہاں نہیں رہیں گے' آج میں نے سلوتری اور کیمپ کمانڈر کی گفتگو اتفاقاً" سن لی' ڈنگر ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ وہ تمام مویشی جو انہوں نے اس باڑے سے نکال کر پہاڑیوں پر چرنے کے لئے چھوڑے ہیں' مر جائیں گے اگر انہیں سردی سے محفوظ' چھتوں تلے نہ لایا گیا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شائد وہ گائیں بھینس ہماری نجات دہندہ ثابت ہوں گی۔" محرم نے پھر مسکراتے ہوئے اس کی آواز سے آواز ملائی۔

جیمو نے گرہ لگائی۔ کسی نہ کسی کو تو یہ کرنا ہو گا اگر انسانوں کو توفیق نہیں ہوگی تو شائد بھینسیں ہی یہ فرض ادا کریں"۔

"میں نے سنا ہے کچھ غیر ملکی صحافی آئے ہوئے ہیں" رائف نے موضوع بدلتے ہوئے کہا' انتظامیہ کے لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ لوگ پھر آئیں گے اور ہم سب کی تصویریں بھی اتاریں گے"۔

حقیقت یہ تھی کہ واقعی اسی دن فرانس کا وزیر صحت برنارڈ کوشیئر ایک ٹیلی وژن ٹیم کے ساتھ منجکا آیا تھا اس نے کچھ قیدیوں سے بات چیت بھی کی تھی اور کیمپ کے افسروں کی کڑی اور مسلسل نگرانی میں ان کے کچھ انٹرویوز بھی فلم بند کیے تھے جن کا ایک ایک لفظ کیمپ کے ریکارڈ میں محفوظ کر

لیا گیا تھا۔

سب سے زیادہ تصویریں گورنجا سانیکا کے اوسمے ڈیڈووچ کی اتاریں گئیں جو دیکھنے میں ایک زندہ لاش لگتا تھا اس کا وزن بمشکل 65 پونڈ تھا' اسے اس کے گھر سے گرفتار کر کے کلجگ کے تھانے میں لے جایا گیا' تھا دو دن بعد اسے کلجک سے بیس میل کے فاصلے منجکا کے سکول کے آڈیٹوریم میں منتقل کر دیا گیا' جہاں سے اسے اپنے علاقے کے چار سو دوسرے لوگوں کے ساتھ پیدل منجکا کیمپ میں لایا گیا تھا۔

اخباری نمائندوں کو صرف دس منٹ تک قیدیوں سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد کیمپ کے افسر انہیں وہاں سے بیرونی دروازے کی طرف لے گئے۔ بعد میں آنے والے بہت سے صحافیوں کے وفود نے قیدیوں کو بتایا کہ اب دنیا ان کے حال سے باخبر ہو چکی ہے اور منجکا کیمپ میں لی گئی تصویریں دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکی ہیں' کچھ ٹیلی وژن ٹیموں کے لوگ اپنے ساتھ سگرٹ بھی لاتے جو ایک سگرٹ فی قیدی کے حساب سے تقسیم ہو جاتے' قیدیوں کے حالات جان کر صحافیوں کے لئے آنسو روکنا مشکل ہو جاتا' مشہور ٹی وی چینلز کے نمائندے اور بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں کے رپورٹر دنیا کے مختلف حصوں سے پہنچ رہے تھے۔

ریڈ کراس کے نمائندے ہر بدھ وار کو باقاعدگی سے آتے' ان سے معلوم ہوا کہ بوسنیا کے بحران سے متعلق تینوں پارٹیوں میں کیمپ ختم کرنے کے سلسلے میں مذاکرات ہو رہے ہیں' پیش رفت اگرچہ بہت سست ہے مگر انہیں امید ہے کہ یہ معاملہ بہت زیادہ طول نہیں کھینچے گا' قیدیوں کو یہ بھی بتایا گیا کہ رہائی کے بعد وہ براہ راست اپنے گھروں کو نہیں جا سکیں گے' پہلے

انہیں کسی ایسے غیر جانبدار ملک میں بھیجا جائے گا جو انہیں قبول کرنے اور اس وقت تک سیاسی پناہ دینے پر آمادہ ہو جب تک بوسنیا ہرزیگوونیا کی سیاسی صورت حال پر امن نہیں ہو جاتی۔

"اچھی خبر یہ ہے کہ بہت سے ممالک' جن میں جرمنی' ہالینڈ' امریکہ' ناروے' نیوزی لینڈ اور کئی اور ملک شامل ہیں رضا کارانہ طور پر تمہیں قبول کرنے کا اعلان کر چکے ہیں"۔

"تم چاہے ہمیں آدھی دنیا دے دو مگر ہمیں صرف اور صرف اپنا بوسنیا چاہیے"۔ جیمو بڑبڑایا' لفظ اس کے گلے میں اٹک رہے تھے' اسے ایک آنسو اپنے رخسار پر حرکت کرتا ہوا محسوس ہوا' جس کی وجہ محرم کے سگرٹ سے اٹھنے والا دھواں تھا یا دکھ اور بے بسی کا شدید احساس! اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا' محرم نے اس کی دلی کیفیت کو سمجھتے ہوئے دوبارہ حوصلہ دینے کے انداز میں کہا---

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں پورے زور کے ساتھ گانا شروع کر دوں کہ "بوسنیا ہمت نہ ہارنا"۔

مگر الفاظ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئے' اسے ایک جھرجھری سی آئی اور اس نے کمبل کے نیچے اپنی پسلیوں کو زور سے دبا لیا۔

کچھ دنوں بعد جیمو کو اپنے بھائی توفیق کا ایک پیغام ملا جس میں بتایا گیا تھا کہ اس کے بیوی بچے ایک قافلے کے ساتھ پریجیڈور سے زاگرب کی طرف براستہ ولاسک' ٹریونک' اور سپلٹ' چلے گئے تھے جہاں سے حالہ مسلمووچ انہیں آسٹریا میں اپنے ٹھکانے کلیگن فرٹ لے گیا ہے۔ مالا جیمو کا بہترین دوست تھا جس نے حالات کا پیشگی اندازہ لگاتے ہوئے بہت عرصہ پہلے

اپنے اہل خانہ سمیت بریڈ ور سے ہجرت کر لی تھی اور جیمو کو بھی اس کے لئے قائل کرتا رہا تھا۔

اپنے خاندان کی حفاظت اور خطرات سے دوری کے خیال نے جیمو کا بہت سا بوجھ ہلکا کر دیا تھا اور اب وہ پہلے کی نسبت زیادہ آسانی سے اپنی قید کی صعوبتیں برداشت کر سکتا تھا۔

"بوسنیا میں سورج تک خون میں ڈوبا رہتا ہے .... شائد تھوک میں سنائی جانے والی ان موت کو سزاؤں کی گنتی میں سورج کا نام بھی آگیا ہے" محرم کہا کرتا تھا

آہستہ آہستہ ان کا وقت کا شعور جواب دینے لگا حالانکہ یہ واحد چیز تھی جو ان کے پاس ضرورت سے زیادہ تھی۔ لمحہ موجود کی گریز پائی اور کسی مقصد حیات کی عدم موجودگی' انہیں اندر سے ڈھاتی چلی جا رہی تھی' وہ نمبروں اور سایوں میں تبدیل ہو گئے تھے' کمر کے پیچھے ہاتھ رکھے' خمیدہ سر-- ان کے منحنی اور کمزور جسموں میں مدافعت کی قوت تیزی سے روبہ زوال تھی۔

چالیس سال سے کم عمر کے ہر قیدی کو روزانہ بیگار کے لیے لے جایا جاتا تھا' صبح ناشتے کے بعد انہیں گیٹ کے سامنے قطاروں میں کھڑا کیا جاتا اور پھر گروپوں کی شکل میں مسلح پہریداروں کی نگرانی میں کام پر بھیج دیا جاتا' کچھ مویشیوں کا خیال رکھتے' قریبی کھیتوں سے آلو کھود کھود کر نکالتے یا مکئی کے بھٹوں سے چھلکے اتارتے اور باقی ٹرکوں کے ذریعے پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع جنگل میں جاتے اور جلانے کے لئے لکڑیاں کاٹ کر ٹرکوں پر لادتے۔ عام طور پر فوجی ان لکڑی سے بھرے ہوئے ٹرکوں کو اپنے گھر لے جاتے یا بازار میں بیچ دیتے' ان کے نزدیک یہ ان کی سربین فوج سے "وفاداری" کا انعام تھا'

افواہ گرم تھی کہ لکڑی کاٹنے کی بے رحم مشقت کے دوران بہت سے قیدی بھی کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ کوزارک سے تعلق رکھنے والا ایک قیدی ، لکڑی سے بھرا ہوا ایک ایسا ٹرک چلانے کی ڈیوٹی دیتا تھا جو کبھی اس کا اپنا ہوا کرتا تھا اور کوزارک پر حملوں کے دوران ضبط کر لیا گیا تھا۔

انیس اور فیکو انتظامیہ کی عمارت سے ملحقہ گیراج میں کام کرتے تھے' کبھی کبھار جب گارڈ ان سے کافی زیادہ فاصلے پر ہوتے تو وہ زیر مرمت گاڑی کا ریڈیو چلا کر خبریں سنتے تاکہ بعد میں انہیں اپنے ساتھیوں تک پہنچا سکیں۔ بعض اوقات ان کے نزدیک ہی بھٹوں کے چھلکے اتارنے والے قیدی' محافظوں کی نظر سے بچا کر خار دار تاروں کے اوپر سے ان کی طرف کوئی پکا ہوا بھٹہ اچھال دیتے جسے بعد میں باورچی خانے میں آگ پر بھونا جاتا یا اس کے بدلے ایک دو سگرٹ حاصل کر لئے جاتے۔

سٹو حسبک نامی گارڈ نے ایک بار ایک قیدی کو اسی طرح بھٹہ پھینکتے دیکھ لیا تو سب کے سامنے اس کی ایسی درگت بنائی کہ خدا کی پناہ -- سٹو حسبک نے اسے دونوں ہاتھوں کی کھلی ہتھیلوں سے ضربیں لگائیں جو اس کی مخصوص تکنیک تھی' اس کے بعد وہ چھ نمبر باڑے میں گیا جو گیٹ سے قریب ترین تھا اور وہاں کے تمام قیدیوں کو ڈنڈ لگانے پر مجبور کیا جب وہ باوجود کوشش کے اپنے کمزور اور ناتواں جسموں کو اٹھا نہ پاتے تو وہ کتوں کی طرح ان پر بھونکتا' ایک بار پریڈوجیوچ نامی ایک اور پہریدار چھ نمبر باڑے میں ایک ایسے قیدی کو ڈھونڈتا آیا جس نے اس کی اطلاع کے مطابق سگرٹوں کے عوض اپنا کمبل بیچ دیا تھا' جب کسی نے اس جرم کا اعتراف نہ کیا تو اس نے جیمو سمیت پہلی اور دوسری قطار کے بیس بیس قیدیوں کو تین گھنٹے تک خاموش اور بے حس و

حرکت کھڑے رکھا قیدیوں نے اس کا نام "علی بابا" رکھ دیا' جیمو اور اس کے ساتھی اسی نسبت سے چالیس چور کہلائے۔

بنجالو کا کے ذوقا نامی فوجی نے ایک بار دو زیادہ عمر کے قیدیوں کی صرف اس لئے دھنائی کر دی کہ انہوں نے اس کی اجازت کے بغیر باڑے سے قدم باہر نکالا تھا' اس نے باری باری دونوں کے پیٹوں پر اپنے گھٹنے سے کم از کم دس دس ضربیں لگائیں۔ کیمپ کے محافظ اعلیٰ سپاگا نے اتفاقاً" ادھر سے گذرتے ہوئے یہ منظر دیکھ لیا اور سب کے سامنے اس فوجی کو ڈانٹتے ہوئے کہا" یہ کیا ذلالت کر رہے ہو! کیوں مار رہے ہو ان بچاروں کو --- یہ دونوں تمہارے باپ کی عمر کے ہیں' چلو اپنا سامان اٹھاؤ اور اسی وقت یہاں سے بنجالو کا دفع ہو جاؤ"

سب جانتے تھے کہ اس حکم کا مطلب کیا ہے' اب ذوقا کو کسی ایک محاذ جنگ پر بھیج دیا جائے گا' دو دن بعد خبر ملی کہ ذوقا نے بنجالو کا میں خودکشی کر لی ہے' اس نے اپنے گھر میں پستول کی نال منہ میں رکھ کر ٹریگر دبا دیا تھا۔

یہ پہلا موقعہ نہیں تھا جب سپاگا نے قیدیوں کی مدد کی تھی' وہ کیمپ کے گرد اپنے ویسپا سکوٹر پر چکر لگاتا رہتا اور کبھی کبھار باڑوں کے اندر بھی آجاتا' وہ سکوٹر پر بیٹھے بیٹھے مسکرا کر چھت کی کڑیوں کے درمیان لگے ہوئے جالوں کی طرف دیکھتا اور کہتا

"بہت خوب' تم نے تو اس جگہ کی خوب سجاوٹ کر رکھی ہے' اب تمہیں نیا سال منانے کے لیے صرف ایک عدد سانتا کلاز کی ضرورت ہے"۔

"میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ ہمیں جاڑا یہیں گذارنا ہے" محرم نے اپنی قنوطیانہ پیش گوئی کا حوالہ دیا

"ایسا نہیں ہو گا محرم" -- پریجیڈور میں بیکری کی مصنوعات بنانے والے ادارے کے ڈائریکٹر ٹرنوسیک نے جواب دیا۔

"ان حالات میں ہمارا جاڑے کی سختیاں سہہ سکنا ناممکن ہے' جب ان ٹوٹی پھوٹی پہاڑیوں پر دس دس فٹ برف پڑے گی تو باہر سے کوئی رسد نہیں آسکے گی اگر ان کے پاس خوراک سے بھرا ہوا کوئی گودام ہوا تب بھی ہم ٹھٹھر کر مر جائیں گے"۔

"تو پھر ان ڈھیروں تیل کے چولہوں کا کیا مصرف ہے؟" محرم نے کیمپ انتظامیہ کی درخواست پر ریڈ کراس کی طرف سے چند دن قبل فراہم کے گئے تیل کے چولہوں کی طرف اشارہ کیا---

"چھوڑو یار محرم تمہیں بھی میری طرح بخوبی علم ہے کہ یہاں کی سردی کو تو زینا کا کی سٹیل مل کی بھٹیاں بھی نہیں مٹا سکتیں' یہ چند کھلونوں جیسے سٹوو کیا کر سکیں گے؟" جیمو نے کہا

"بے شک مجھے پتہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ انہیں یہاں کس لیے رکھا گیا ہے؟"

اس پر میرو یہ جانتے ہوئے بھی کہ محرم کی سوچ کے مایوس کن تناظر کو بدلنا بہت مشکل ہے' گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولا --- "دیکھو ان لوگوں نے پانی کی سپلائی کے لیے کتنا پائپ بچھایا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ ابھی تک ہمیں پانی فراہم نہیں ہوا' ان کے پاس ضرورت کے مطابق ڈیزل موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہمیں جھیل سے پانی کی بوتلیں نہیں بھرنا پڑیں گی .... یہ سب ایک تماشہ ہے ...... وہ لوگ اس طرح صرف وقت حاصل کر رہے ہیں" ان کے عقب سے

آواز آئی۔

"میں نے سنا ہے کہ آج پھر کوئی طلبی ہونے والی ہے۔ سنا ہے ہم میں سے کچھ لوگ قیدیوں کے تبادلے میں چھوڑے جا رہے ہیں" ایک اور آدمی، فیہو سرحتلک جو سرائیوو ریڈیو کا نمائندہ ہوا کرتا تھا، ان کے سامنے آ کر بیٹھتے اور سگرٹ سلگاتے ہوئے بولا

"مجھے ہمارے ڈیوٹی پر متعین آدمی میسو نے بتایا ہے کہ اس نے خود سپاگا کو ایک فوجی سے یہ بات کرتے سنا ہے"

"اسی سہ پہر، چوبیس آدمیوں کو طلب کیا گیا جن میں فیہو بھی شامل تھا، اس نے اپنی گنتی کی چند چیزیں جمع کیں اور افسوس کے انداز میں سر کو دائیں بائیں جھٹکا۔ خاصی دیر اپنے پانچ سالہ بیٹے کی تصویر کو دیکھا، آستین کے کنارے سے اپنی پلکیں صاف کیں، تصویر کو واپس اپنے سامان میں رکھا اور گیٹ کی طرف چل دیا، لگ بھگ آدھے گھنٹے کے بعد ایک خاکی رنگ کی فوجی بس باورچی خانے کے پاس سے گذری اور دور تک کچی بل دار سڑک پر گرد اڑاتی اور دائرے کی شکل میں گھومتی ہوئی چمنی کے پاس سے گذرتے ہوئے آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اگلی صبح ناشتے سے بھی پہلے تمام کروشین نسل کے قیدیوں کو طلب کر لیا گیا انہیں حکم دیا گیا کہ وہ پندرہ منٹ کے اندر اپنا اپنا سامان لے کر گیٹ کے سامنے قطاریں بنائیں، انہیں چار بسوں میں سوار کیا گیا۔ امارسکا سے منجکا کیمپ کے سابقہ تجربے کی وجہ سے تمام قیدیوں نے پانی کی بوتلیں بھر کر ساتھ رکھ لیں کیونکہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ سفر کتنا لمبا ہے! اس بار محافظ نئے تھے۔ یہ بنجالوکا کے فوجی تھے جونہی بسیں روانہ ہوئیں ایک فوجی، ایک ایک

قیدی کے پاس گیا اور انہیں مٹھی مٹھی بھر نمک دے کر اسے کھانے کا حکم سنایا اور ساتھ ہی دھمکی دی کہ

"اگر مجھے نمک کا ایک ذرہ بھی تمہارے ہاتھ یا سیٹ پر نظر آیا تو تم ساری عمر پچھتاؤ گے"۔

اس نے بندوق کی سنگین کو بائیں ہاتھ کی کھلی ہتھیلی پر خطرناک انداز میں تھپتھپایا اور بے حیائی کے انداز میں ہنسا۔

قیدیوں میں ہوٹل پر یجیڈور کا ڈاکٹر نونو بھی تھا جو ایک معروف اور پسندیدہ شخص تھا نونو نے نمک اپنے منہ کے قریب لا کر زبان سے چکھا مگر وہ اس قدر تلخ اور بد ذائقہ تھا کہ اس کا جی اسے ایک دم تھوکنے اور پھینکنے کو چاہا مگر اس نے خطرے سے بچنے کے لئے فوجی کی نظر اور توجہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہونے کا انتظار کیا اور پھر ایسے محتاط انداز میں سارا نمک اپنی جراب میں انڈیلا کہ ایک ذرہ بھی باہر فرش پر نہ گرنے پائے' تھوڑا سا نمک اس نے اپنے ہاتھ لگا رہنے دیا جسے چاٹتے وقت اس کے چہرے پر عجیب طرح کے مضحکہ خیز تاثرات نمودار ہوتے تھے۔

فوجی ایک تحقیر آمیز انداز میں سیٹوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے گاہے بگاہے بغیر کسی وجہ کے قیدیوں پر ڈنڈے برسانے لگ جاتا' اس دوران میں بس مختلف جگہوں سے گذرتی ہوئی ڈروار پہنچ گئی۔ ڈروار سے دو اور فوجی بس میں سوار ہوئے جنہوں نے آتے ہی اپنے آہنی سروں والے ڈنڈوں سے مار پیٹ شروع کر دی' ان میں سے ایک نے سیٹوں کے دونوں طرف بنے سامان رکھنے والے خانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو اٹھایا اور پھر بس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قیدیوں کی پسلیوں پر زور دار ٹھوکریں مارتا چلا

گیا

"مجھے پتہ ہے تم یہاں سے ٹھیک ٹھاک شکلوں کے ساتھ واپس جانا چاہتے ہو' سو سر اور چہرے میں چھوڑ رہا ہوں میں صرف تمہارے گردے باہر نکالوں گا۔

یہ کہتے ہوئے وہ جنونی فوجی' دیوانوں کی طرح ہنستے ہوئے اپنے اس وحشیانہ کھیل میں دوبارہ مصروف ہو گیا۔

سہ پہر کے وقت وہ "نن" پہنچے جو ساحل سمندر سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر تھا اور آج کل سرب جمہوریہ کراجینا کا دارالخلافہ کہلاتا تھا۔

"تقریباً" آدھے گھنٹے میں اقوام متحدہ کے نمائندے اور ہم اس سرحد پر پہنچیں گے جس کے دوسری طرف کا علاقہ کروشیا کی فوجوں کے قبضے میں ہے' وہاں تمہارا تبادلہ ان سرب فوجیوں سے کیا جائے گا جو ان کے کیمپوں میں محصور ہیں جب ہم وہاں پہنچیں تو تم لوگ دو دو کر کے ان کی بسوں میں سوار ہو جانا' کوئی حماقت کرنے کی کوشش نہ کرنا اس سے تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ یہ جنگ ہے کوئی کھیل نہیں!"

یہ باتیں ان سے ایک ایسے سربین آفیسر نے کیں جس کی ٹوپی اور وردی کی آستینوں پر بہت سے تمغے اور اعزازی نشانات لگے تھے قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ وزارتی نوعیت کے عہدے پر فائز ہو گا بس "نن" سے بغیر رکے گذرنے کے بعد "ڈرنس" سے تقریباً پانچ میل آگے جا کر رکی' قیدی اپنی سیٹوں پر سر جھکائے اگلے حکم کے منتظر بیٹھے تھے' انتظار کا یہ وقفہ تقریباً" دو گھنٹے پر محیط تھا۔

"انہیں واپس "نن" لے جاؤ' دوسری طرف سے "تبادلے" والے

لوگ نہیں آئے ہم کل پھر کوشش کریں گے"۔

اسی افسر نے بسوں کے سامنے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔

انہیں "نن" واپس لے جایا گیا اور ملٹری بیرکس کی جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا' ان کے ساتھ آئے ہوئے فوجی گارڈ سونے کے لیے چلے گئے اور قیدیوں کی ذمہ داری مقامی لوگوں کے ایک خصوصی ٹولے کے ہاتھ آگئی جو "نن بوائز" کہلاتا تھا اور اپنی ظالمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت بدنام تھا یہ سب کے سب لوگ "مارشل آرٹس" میں تربیت یافتہ تھے اور ہمہ وقت اپنی اس مہارت کے مظاہرے کے لیے بے تاب رہتے تھے ٹھوکریں اور لوہے کی "شاموں" والے لمبے ڈنڈے ان کے پسندیدہ ذرائع تشدد تھے اس وحشیانہ کھیل میں انہوں نے اپنے کچھ شہری دوستوں کو بھی مدعو کر لیا مارپیٹ کے ساتھ ساتھ وہ تجمان اور کروشیا کو گندی گندی گالیاں دیتے اور قیدیوں کی ماؤں کے لیے حرام کار اور نازیوں کی اولاد کے الفاظ استعمال کرتے رہے' یہ سلسلہ نصف رات تک جاری رہا یہاں تک کہ وہ تھک کر خاموش ہو گئے۔

صبح دم قیدی ایک جنگلہ لگے احاطے میں لے جائے گئے اور انہیں مجبور کیا گیا کہ "چیٹ نک" گانے گائیں' دوپہر کے وقت محافظوں نے آکر بتایا کہ قیدیوں کا تبادلہ نہیں ہوگا کیونکہ کروشیا والے خود اپنے ہم وطنوں کو واپس نہیں لینا چاہتے اور یوں انہیں پہلے والی بسوں پر ہی واپسی کا سفر کرنا پڑا۔

جب وہ "گرانسانسکو گراہوو اور دروار کی طرف جا رہے تھے ایک فوجی نے آواز لگائی۔

"تم میں سے کسی کو گانا آتا ہے؟"

"مجھے آتا ہے" بس کے عقبی حصے سے کسی نے جواب دیا۔

"کون ہو تم -- سامنے آکر بات کرو .... اور ذرا اپنا چہرہ تو دکھاؤ"

یہ "ملوٹن ڈماک' نامی ایک نوجوان تھا جو بوسنیا کے مختلف ریستورانوں میں اپنی گائیکی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا اگرچہ وہ ایسے ماحول میں گانا نہیں چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر کہ شائد اس کی موسیقی کی وجہ سے اس کے کچھ ساتھی وحشیانہ تشدد سے بچ جائیں' وہ تیار ہو گیا۔

"یہاں -- ادھر میرے سامنے آؤ" فوجی نے سامنے کی سیٹ والے ایک قیدی کو ملوٹن کے ساتھ جگہ بدلنے کا حکم دیتے ہوئے کہا!

"تمہیں وہ گانا آتا ہے ---- فوجی سربیا کے میدانوں میں ناچ رہے ہیں"

"بالکل آتا ہے" ملوٹن نے کہا اور ساتھ ہی گانا شروع کر دیا' اس کی آواز میں ہلکی سے لرزش تھی مگر اس نے سر اور لے کو قائم رکھا' منجکا تک واپسی کے سارے رستے میں وہ گاتا رہا سوائے ان وقفوں کے جب وہ سگرٹ یا فوجیوں کی دی ہوئی آلو بخارے کی برانڈی کے ایک دو گھونٹ پیتا۔

"تم نے اچھے گانے سنائے ہیں ..... لگتا تھا جیسے کوئی سرب گا رہا ہے" ایک فوجی نے حقارت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے اسے داد دی' وہ رات نو بجے منجکا پہنچے جہاں پورے دن میں پہلی بار انہیں کھانے کو کچھ ملا۔

بعد میں خبر پھیلی کہ اس تبادلے کے پروگرام کی ناکامی کی وجہ منجکا کیمپ کا ایک کروشیئن قیدی افسر تھا جس کا نام فہرست میں تو تھا مگر اسے لے جایا نہیں گیا تھا جب کروشیا والوں کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے جواباً تبادلے کا سارا پروگرام ہی ختم کر دیا' اگلے روز فیو سرختلک اور اس کے ساتھ جانے والا گروپ تبادلے کی ایک اور ناکام کوشش کے بعد واپس آ گیا' وہ لاسک پہاڑی پر لے جائے گئے تھے' جہاں سے نیچے ٹراونک کا قصبہ نظر آتا

ہے' ان پر کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا بلکہ الٹا انہیں کھانا بھی دیا گیا کچھ دن بعد فیھو' نونو' ایڈن سکلجا (جو گلیموک کا ایک مصور تھا) اور ان کے ساتھ آٹھ اور لوگ طلب کیے گئے' جلد ہی دوسرے قیدیوں کو پتہ چل گیا کہ انہیں لاسک کی سرحد پر لے جایا گیا ہے اور یوں بالآخر ایک کامیاب تبادلہ انجام کو پہنچا۔

بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے منجکا کے آسمان پر مسلسل جمع ہوتے رہتے' منجکا جو دکھوں کا ایک ٹھکانہ بن چکا تھا! ----- کچی سڑک سے اٹھنے والے گرد کے بادل کی اوٹ سے ہر نئی آمد امید کے بجھتے ہوئے شعلے کو پھر سے روشن کر دیتی تھی۔

جیمو اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر جیسے کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا

"او خدایا ----- ان کو دیکھو --- ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو' ان کے چہرے دیکھو' ان کے تباہ شدہ وجودوں پر نظر ڈالو -----"

اور اس کے بعد پھر اسے اپنے رخساروں پر بے آواز بہتے ہوئے آنسوؤں کا شعور سنائی دیتا ہوا محسوس ہوتا!۔

"کیا کبھی کوئی ان لوگوں کا دکھ جان سکے گا جنہیں تقدیر یہاں لے آئی ہے؟ دکھ نے ان کی انکھیں دھندلا دی ہیں اور ان کے چہرے مسخ کر دیئے ہیں' خوف کی وجہ سے ان کے بال قبل از وقت سفید ہو گئے ہیں' دیکھے ہوئے خوفناک مناظر کا تصور کر کے وہ نیند میں چیخیں مارنے لگتے تھے' تمام قیدی ان دہشت بھری یادوں کو بھولنا چاہتے تھے لیکن اپنی من مرضی کرنے والی موت نے انہیں اپنا چشم دید گواہ مقرر کر لیا تھا' اس بے معنی تاریکی میں کب روشنی

کی کوئی کرن لہرائے گی؟

جمو کی آنکھوں میں ہمہ وقت انہی خدشوں کی پرچھائیاں تیرتی رہتی تھیں۔

اس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈالتی ہوئی اونچی نیچی پہاڑیوں اور کیمپ کے سامنے پھیلے ہوئے وسیع اور ہموار قطعہ ء زمین کو دیکھا دور کہیں سے آتی ہوئی دھماکوں کی ایک مدھم آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

"لگتا ہے پھر بارش ہونے والی ہے' تم نے بادلوں کی گرج سنی؟" اس نے کہا

"یہ بموں کے دھماکے ہیں" محرم نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا

"آج وہ ہمارے کچھ لوگوں کو بیرکوں میں لے گئے تھے جہاں انہیں مارٹر توپوں کے گولے ٹرکوں پر لادنے کو کہا گیا انہوں نے بتایا ہے کہ وہاں بے شمار گولہ بارود ہے"

"تلواروں کی صحبت میں رہنے والے ایک نہ ایک دن خود ہی ان کا شکار ہو جاتے ہیں" کسی نے لقمہ دیا

اس کے بعد رات اور بارش دونوں آئے!

اس رات کیمپ کی خاموشی' کتوں کے بھونکنے کی وجہ سے بار بار ٹوٹتی رہی درمیانی وقفوں میں گاہے بگاہے دور کہیں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں بھی آتی رہیں' صبح پتہ چلا کہ کچھ قیدی کیمپ سے فرار ہو گئے ہیں اور کھوج لگانے والی ٹیمیں ان کا پیچھا کر رہی ہیں' پہرے پر مامور قیدی اس واقعے کی وجہ سے سخت ناراض تھے چنانچہ انہوں نے سارے دن میں ایک بھی قیدی کو کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دی۔

"بھاگنے والے" حلیل چرواہے کا بیٹا اور اس کا دوست ہیں جو ہمیشہ اکٹھے نظر آیا کرتے تھے" محرم نے جو ہر معاملے کی خبر رکھنے کا عادی تھا' جیمو کو بتایا

"وہ کل رات سات بجے کے لگ بھگ دھند کے دوران نکلے' انہوں نے بارودی سرنگوں والے علاقے کو پار کیا جس میں دبے ہوئے ڈیٹونیٹروں کی شناخت وہ خشک مچھلی کے خالی ڈبوں کی مدد سے کر چکے تھے۔ وہ خار دار تاروں کے اوپر سے کودے ساتھ والے باڑے سے انہوں نے دو بہترین گھوڑے چرائے' ان پر زینیں ڈالیں اور رات کی تاریکی میں فرار ہو گئے' بعد میں پہریداروں نے تعاقب کے لئے مسلح ٹیم ترتیب دی (گذشتہ شب سنائی دینے والی فائرنگ اور کتوں کی آوازیں اسی پارٹی کی تھیں) لیکن وہ ان کے قابو نہیں آئے ایک تو اس لیے کہ انہیں تعاقب شروع ہونے سے پہلے خاصا وقت مل گیا تھا اور دوسرے یوں کہ حلیل کا بیٹا اسی علاقے میں بھیڑیں چراتا رہا تھا اور وہاں کے چپے چپے سے واقف تھا' ان کے پاس وہ تمام خوراک' جو باورچی سے سگرٹوں کے بدلے خرید کر محفوظ کر لی گئی تھی اور تین تین کمبل تھے۔

بعد میں حلیل چرواہے کی پیشی ہوئی' تفتیشی افسروں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے بیٹے کے فرار کے پروگرام کے بارے میں کیا جانتا ہے اور اس کے خیال میں وہ کس راستے سے کہاں گیا ہو گا؟ حلیل نے قسمیں کھا کر انہیں یقین دلایا کہ اسے کسی بات کا پتہ نہیں بلکہ گذشتہ کچھ دنوں سے اس کی اپنے بیٹے سے سرے سے گفتگو ہی نہیں ہوئی اور یہ کہ اسے بالکل اندازہ نہیں کہ وہ کدھر گئے ہوں گے! حلیل پر تشدد نہیں کیا گیا صرف تاکید کی گئی کہ اگر اسے کسی بات کا پتہ چلے تو وہ گارڈ ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں کے ذریعے فوراً" انہیں

اطلاع کر دے' بہت دن بعد حلیل کو پتہ چلا کہ دونوں مفرور لیویو پہنچ کر بوسنیا ہرزیگووینا کی دفاعی فوج میں شامل ہو گئے ہیں -- کچھ وقت گذرنے کے بعد حلیل نے دوستوں کو بتایا!

"اس کے فرار سے تقریباً" ایک ماہ پہلے میں نے واقعی اس کے ساتھ بول چال بند کر دی تھی بلکہ ایک بار تو ہمارا سب قیدیوں کے سامنے آپس میں سخت بحث مباحثہ بھی ہوا لیکن یہ سارا ڈرامہ تھا جو ہم نے ایک منصوبہ بندی کے تحت کیا تھا تاکہ میرا بیان ان کے فرار کا رستہ کھوٹا نہ کر سکے"

منجکا کیمپ سے فرار کی یہ واحد کوشش تھی جو کامیاب ہوئی' اس سے پہلے کوزارک کے دو باشندے شہباز اور بیسک جو بیس دوسرے قیدیوں کے ساتھ لکڑی کاٹنے کی مشقت کر رہے تھے' جنگل کے راستے فرار ہونے کی کوشش کر چکے تھے۔ انہیں لکڑیاں جمع کرنے کے لئے آگے تک جانا تھا مگر وہ وہاں رکے نہیں اور آگے چلتے چلے گئے۔ پانچ چھ گھنٹے تک ان کی عدم موجودگی کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا' اس کے بعد ان کی گرفتاری کے لئے تجربہ کار فوجیوں پر مشتمل ایک مخصوص ٹیم روانہ کی گئی۔ شہباز اور بیسک کو منجکا کے بارے میں زیادہ معلومات تو نہیں تھیں مگر اتنا اندازہ ضرور تھا کہ انہیں کس سمت جانا چاہیے' مغرب کی طرف سفر انہیں پر یجیڈور سے قریب تر لے جاتا جو ان کا دیکھا بھالا علاقہ تھا۔ پہلی رات انہوں نے ایک سرزمین گاؤں کے کنارے ایک باڑے میں پرالی کے ڈھیر پر گذاری وہ وہاں پوری رات کے بجائے صرف دو تین گھنٹے رکے تاکہ تھوڑا سا آرام کے ساتھ یہ تسلی بھی کر لیں کہ تعاقب کرنے والے شکاری ان کے راستے پر نہیں ہیں سورج نکلنے سے بہت پہلے ہی وہ جنگلوں اور کھلی جگہوں کے درمیان سفر پر

روانہ ہو گئے' دوپہر کے لگ بھگ وہ سنسکی موسٹ پہنچ گئے جہاں کسی کے نظروں میں آئے بغیر وہ ہجوم میں شامل ہو گئے اور ایک بس میں سوار ہو کر پری جے ڈور کی طرف چل پڑے' وہاں انہوں نے ایک چھوٹے سے کیفے میں بیئر پی اور پھر پیدل ہی عام راستوں سے ہٹ کر کوزارک کی طرف روانہ ہو گئے' چند راتیں کوزارک کے کھنڈرات میں گذارنے کے بعد وہ کوزارک پہاڑی اور سیوا دریا کی جانب اس امید پر چلنا شروع ہوئے کہ اس طرح وہ کروشیا کے آزاد علاقے تک پہنچ جائیں گے' وہ سیوا کے دائیں کنارے پر واقع ایک مسلمان گاؤں بوسانسکا اور ہووا تک پہنچ سکے جہاں شہباز کی ایک خالہ رہتی تھی

اس گاؤں کے بیشتر لوگ ابھی تک وہیں تھے کیونکہ انہوں نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اس وقت تک سربوں نے ان کی پکڑ دھکڑ شروع نہیں کی تھی۔

رات وہاں رکنے کے بعد علی الصبح شہباز اور بیسک نے سیوا دریا کو تیر کر عبور کرنا شروع کیا' شہباز کسی کی نظروں میں آئے بغیر آسانی سے دریا عبور کر گیا' بیسک ماہر تیراک نہیں تھا وہ گہرے پانی میں ڈبکی مارنے میں کامیاب نہ ہو سکا شہباز نے دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس کی ہمت بڑھانے کے لئے اسے ہاتھوں کے اشارے کئے لیکن بیسک کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے پانی میں چند قدم چلنے کے بعد واپس کنارے کی طرف چلنا شروع کر دیا' شہباز تیرتا ہوا واپس اس کے پاس آ گیا کیونکہ وہ اپنے دوست کو تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد سربوں کی ایک گشتی پارٹی نے انہیں پکڑ لیا اور وہ

ایک فوجی گاڑی میں واپس منجکا کیمپ میں لائے گئے جہاں بہت دنوں تک ان پر مسلسل تشدد ہوتا رہا۔ ایک رات غروب آفتاب کے بعد جب سب قیدی اپنی اپنی جگہ پر تھے' شہباز اور بیسک کو ان سب کے سامنے ٹھوکروں اور ڈنڈوں کی بوچھاڑ میں پھرایا گیا' محافظ ان کو سروں سے پکڑ کر دروازوں سے ٹکراتے تو وہ درد سے دوہرے ہو کر زرد زور سے چیختے اس قدر مار پیٹ کے باوجود وہ نہ صرف بچ گئے بلکہ صحت یاب بھی ہو گئے۔

ایک اور قیدی آلوؤں کی کھیت سے جو قریب ہی واقع تھا کام کرنے کے دوران فرار ہوا جس کے بارے میں کبھی کوئی خبر نہ مل سکی۔ اگر وہ پکڑا گیا تھا تو سرب اسے واپس منجکا کیمپ میں نہیں لائے!

دسواں باب

جوں جوں پہاڑیوں پر چمکتے ہوئے سورج کی حدت کم ہوتی گئی دن چھوٹے ہونے لگے۔ بادل گھر کر آتے اور کھل کر برستے جس کی وجہ سے جگہ جگہ کیچڑ سے بھرے جوہڑ بن گئے تھے جن میں پتھروں اور مٹی کا چونا گھلا ہوا تھا' اس کیچڑ میں نچڑے ہوئے جسموں والے قیدیوں کے بھیگے ہوئے جوتوں کے نشان جم کر مٹی رنگ کے ہو گئے تھے۔ ان کے نحیف و نزار جسموں پر زردی کی ایک ایسی تہہ سی جم گئی تھی جیسے انہیں مائع موم میں ڈبکی دی گئی ہو ان کے استخوانی رخساروں سے باہر کو نکلی ہوئی آنکھوں میں سوائے غم کے اور کوئی عکس نہ تھا۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی امیدیں بھی پست سے پست تر ہوتی جارہی تھیں اور دعا کے لیے آسمان کی طرف اٹھنے والے ہاتھوں میں واضح کمی واقع ہو رہی تھی۔ جھکتی ہوئی کمروں کی وجہ سے ان کی نظریں عام طور سے زمین پر ہی جمی رہتی تھیں۔ کچھ لوگ کھلی آنکھوں سے سوتے اور چھت کے سوراخوں میں سے آہستہ آہستہ اندر آتی ہوئی برف کو دیکھتے رہتے۔ دروازے کے قریب والوں کے چہروں پر لالٹین کے شیشے سے جھانکتے ہوئے سائے طرح طرح کے نقش بناتے جو اپنے منڈے ہوئے سروں پر ٹوپیوں کو مضبوطی سے جما کے رکھتے تھے۔ کھانے کے لیے دیئے گئے سیب ان کے حلق میں پھنس پھنس جاتے' ایک مسلسل بے چارگی نے ان کی رُوحوں پر تسلط قائم کر لیا تھا اور دن ایک ناستک کے ہاتھ میں پکڑی ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرتے چلے جارہے تھے' پہاڑیوں کی درمیانی سطح مرتفع اور

چھتوں پر برف کی نقرئی تہہ دبیز ہوتی جارہی تھی اور ایک گہری دھند قیدیوں کے باڑوں کے درمیان ہمہ وقت معلق رہتی تھی۔

"میں نے کہا نہیں تھا کہ ہمیں موسم سرما یہیں گذارنا ہوگا" محرم نے کہا

باہر برف مسلسل گر رہی تھی اور غم آلود ہوا کی گونج شکستہ دیوار کے رخنوں سے اندر آرہی تھی

"تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ منجکا کی اصل سردی کیا ہوتی ہے؟ اس کے قریب بیٹھے علی جاہ نے اپنے سردی سے سن ہوتے ہوئے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔

یہ تو ابھی ابتدا ہے لیکن تم بدشگونی کی باتیں مت کرو' ہم پہلے ہی بہت بھگت چکے ہیں"

حارث نے' جو صحیح معنوں میں ایک مخیراور نرم دل انسان تھا اور ان سے ملحقہ باڑے میں تھا'گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا!

"رات میں نے خواب دیکھا کہ میں گھر پہنچ گیا ہوں مگر یہ کوئی اچھا خواب نہیں تھا کیونکہ اب وہاں میرے گھر والوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا' سنسکی موسٹ کے پولیس آفیسر بائم نے کہا

"رات میں نے ایک ٹوٹتا ہوا ستارہ دیکھا جو اپنے پیچھے روشنی کی ایک لمبی جھلملاتی ہوئی لہر چھوڑتا جا رہا تھا' اس کے بعد مجھے دیر تک نیند نہیں آئی' میں خیالات کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ مجھ پر شاعری وارد ہونا شروع ہوئی' میں نے اپنے ان موجودہ ناگفتہ بہ حالات کے بارے میں ایک پوری نظم بنا لی لیکن صبح اٹھنے پر وہ مجھے بھول گئی۔ صرف ایک ابتدائی لائن یاد رہ گئی ہے جو

کچھ یوں ہے۔

"بالآخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ میرے وجود کی نشانی صرف میرا نام ہی رہ گیا"

"جنیوا معاہدے کی شرائط کے حوالے سے جو کچھ ہو رہا ہے' بالکل صحیح ہو رہا ہے" محرم نے طنز کیا

"جب تم یہ نظم لکھ رہے تھے' اس وقت انتظامی بلاک میں مجھے مار پڑ رہی تھی" حارث نے بائم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا سب لوگ حارث کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"انہوں نے کل شام سورج ڈھلنے کے فوراً بعد مجھے طلب کیا اور انتظامی بلاک میں واقع ایک کمرے میں لے گئے' میرے ساتھ صرف ایک سپاہی تھا' کچھ دیر بعد ایک اور آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ مجھے یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی' میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میرے سامنے میرا سب سے بڑا بیٹا ڈینس کھڑا تھا' کچھ دیر تو میں حواس باختہ سا اسے دیکھتا رہا پھر میں نے پوچھا"

"یہ تم کس فوج میں شامل ہو گئے ہو؟"

میں کافی دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا مگر وہ مجھ سے آنکھیں ملائے بغیر سر کو ایک طرف جھکائے خاموش اور متذبذب کھڑا رہا' اگرچہ فرط غم سے میری چیخیں نکل رہی تھیں لیکن میں اسے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ

"اپنی اس فوج پر لعنت بھیج دو -- میرے بیٹے"

لیکن وہ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے چلا گیا اور دوسرے سپاہی نے مجھے مارنا شروع کر دیا' ساتھ والے کمرے سے بھی کسی کے چیخنے چلانے کی

آوازیں آ رہی تھیں۔

"جب تک وہ ان اوباش وحشیوں کی وردی پہنے ہوئے ہے میں اسے دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا' ایسے بیٹے پر میں ایک نہیں' ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں"۔

حارث نے اس نئی صورت حال کے جذباتی ہیجان سے پیدا شدہ' شدید بے چینی میں' اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے کہا

ماحول پر ایک گھمبیر خاموشی طاری ہوگئی' حارث کی روداد سے معمور فضا کے گہرے جذباتی تاثر کو کوئی بھی توڑنا نہیں چاہتا تھا' کوئی ایک یا دو منٹ بعد ایک عظیم اور پرشور دھماکے کی آواز چاروں طرف پھیل گئی اور ان سے اگلے باڑے پر ریت بجری' ریزہ ریزہ پتھروں اور مٹی کے انبار کی بارش ہونے لگی' پتہ چلا کہ کوٹرڈیرویں کے ایک قیدی کا پاؤں اس وقت اتفاقاً" بارودی سرنگ پر جا پڑا تھا' جب وہ اپنی دھوئی ہوئی قمیض سکھانے کے لیے اسے خار دار تاروں کے جنگلے پر ڈال رہا تھا' اس حادثے میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں جن میں سے ایک گھٹنے کے نیچے سے جوتے سمیت کٹ کر ملحقہ باڑے کی چھت پر جا گری۔

شدید پریشانی کے عالم میں پہرے پر مامور سپاہیوں نے تمام قیدیوں کو باڑوں میں بند کر دیا اور دروازہ کھولنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔ دروازے کے قریب والوں نے ڈاکٹر منصور کو دو سپاہیوں کے ساتھ بد نصیب قیدی کے زخمی وجود کو انتظامیہ کی عمارت کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھا' قیدی کی دوسری شکستہ خون آلود ٹانگ کے ٹکڑے اس کی کٹی پھٹی کھال کے ساتھ لٹک رہے تھے' اسے کار میں ڈال کر بنجالوکا کے ہسپتال لے جایا گیا لیکن دو دن بعد اس کی موت واقع ہو گئی' بہت زیادہ خون ضائع ہو جانے کے باعث اس کے

نزار جسم میں زخموں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

پانچ اور قیدی بھی جنگل میں کام کے دوران زہریلی کھمبیاں کھانے کے باعث اسی ہسپتال میں لے جائے گئے۔

نومبر کے آغاز میں کچھ تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں' عالمی ریڈ کراس کے نمائندے اب روزانہ آنے لگے تھے اور قیدیوں کو بار بار یقین دہانی کرا رہے تھے کہ منجکا کیمپ بہت جلد ختم کیا جا رہا ہے' مردم آزار محافظوں کے طرز عمل میں بھی ایک واضح مثبت تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ اب وہ دن میں موسم بہتر ہونے کی صورت میں' کسی بھی وقت قیدیوں کو اپنے باڑے سے باہر آنے کی اجازت دے دیتے اور قیدی باڑوں کے باہر ٹائلوں والے فرش پر سورج ڈوبنے سے پہلے آزادانہ گھوم پھر سکتے تھے لیکن اس کے بعد انہیں واپس ان کی کوٹھڑیوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ دن پر دن گذرتے چلے گئے۔ ماحول کی اس یکسانیت کو صرف ان سرب جنگی طیاروں کی اعصاب شکن آواز ہی توڑتی تھی جو باڑے کی چھتوں سے پہلو کے بل جھک کر پرواز کرتے ہوئے گذرتے تھے۔ ہوائی جہازوں سے شدبد رکھنے والے قیدیوں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ منجکا کیمپ کے بالکل اوپر کی فضا میں آواز کی حد رفتار کو توڑنے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جونہی وہ کان بہرے کر دینے والا زور دار دھماکہ ہوتا محافظ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے اور اس وقت تک اس انوکھے تجربے سے محظوظ ہو کر مسکراتے رہتے جب تک جہاز اپنے پیچھے دھوئیں کی ایک پتلی لکیر چھوڑتے ہوئے پہاڑیوں کے عقب میں گم نہ ہو جاتے۔

ہفتے میں دو بار "مرحمت" نامی انسانی حقوق کی ایک اسلامی تنظیم کے نمائندے بنجالوکا سے خوراک اور کپڑوں کے وہ پیکٹ پہنچانے آتے جو قیدیوں

کے عزیز و اقارب نے بھجوائے ہوتے تھے۔ کیمپ کے قواعد کے مطابق ایک وقت میں پچاس سے زیادہ پیکٹ قبول نہیں کیے جا سکتے تھے۔ یہ پیلٹ پہلے ڈیوٹی پر موجود پہریداروں کے پاس آتے جو ان کا بغور جائزہ لیتے اور سگرٹ، پھل، چاکلیٹ اور بہتر کپڑے ایک طرف نکال کر آپس میں تقسیم کر لیتے اور اس کے بعد بچی کھچی چیزیں متعلقہ قیدیوں میں بانٹ دی جاتیں۔ تمام خطوط پڑتال کے مرحلے سے گذرتے لیکن زیادہ تر کو پھاڑ کر پھینک دیا جاتا بہت کم ایسا ہوتا کہ قیدیوں میں سے کسی کا چہرہ آنے والے پیغام کی وصولی پر دمک اٹھتا۔

کیمپ کے خاتمے کے بارے میں ہونے والی گفتگو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، افواہ گرم تھی کہ کراڈزک نے خود اس نوع کے ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں، قیدی ہر روز صبح سویرے سے ریڈ کراس کے نمائندوں کی آمد کا بے چینی سے انتظار شروع کر دیتے۔

13 نومبر کی صبح دھند اور برف آلود ہوا سے بھری تھی، اس سے پہلے گذرے ہوئے بے شمار دنوں کی طرح یہ دن بھی سوائے وقت گذاری کے حیلے ڈھونڈنے کے اور کوئی پیغام نہ لایا تھا، دوپہر کے وقت ان کو واپس اپنی کوٹھڑیوں میں جانے کا حکم ملا، عام خیال یہی تھا کہ یہ ان رپورٹروں سے ایک اور ملاقات کی تیاری ہے جو ہمیشہ ان سے باتیں کرنے اور ان کے نحیف و نزار جسموں کی تصویریں لینے کے مشتاق رہتے تھے لیکن عین دوپہر کے کھانے سے پہلے ایک فوجی آیا اور اس نے اعلان کیا۔

"جس جس کا میں نام پکارتا جاؤں وہ فوراً" بیرونی دروازے کے سامنے لائن میں کھڑا ہو جائے۔ شاباش جلدی کرو"

"کیا ہم اپنا سامان ساتھ لے جائیں؟" کسی نے استفسار کیا

"نہیں ..... سب کچھ یہیں رہے گا" سپاہی نے یہ حکم صادر کرنے کے ساتھ ہی اعلان کیا کہ 1950 یا اس سے قبل اور 1972 یا اس کے بعد پیدا ہونے والے تمام قیدی تیار ہو جائیں اس کے پاس ایک طویل فہرست تھی جس سے وہ قیدیوں کے ناموں کے آخری حصے حروف تہجی کے اعتبار سے پڑھتا چلا گیا۔

"شائد قیدیوں کا کوئی اور تبادلہ ہو رہا ہے! لیکن اگر ایسا نہیں بھی ہے تب بھی یہ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم یہاں مستقبل سے مکمل طور پر بے خبری کی حالت میں پڑے رہیں" تمہارا سال پیدائش کیا ہے؟ محرم نے پوچھا

"1949" جیمو نے جواب دیا

"چلو یہ اچھا ہوا کم از کم ہم اکٹھے تو رہ سکیں گے! کیا معلوم ..... کل کیا ہو؟.....

یہ کہتے ہوئے پہلی بار محرم کے چہرے پر جیسے مسکراہٹ کی ایک پرچھائیں سی لہرائی۔

جیمو کا نام شروع میں ہی پکار لیا گیا' وہ باہر نکلا اور گیٹ کے سامنے جمع قیدیوں کے چھوٹے سے گروہ میں شامل ہو گیا جسے محافظ قطاروں میں کھڑا کر رہے تھے۔ ان کے نام دوبارہ پکارے گئے اور اب کے ان کو پچاس پچاس کے گروہوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ہر قطار میں پانچ آدمی تھے قیدیوں کو تاکید کی گئی کہ وہ گروپ میں اپنی مقرر کردہ مخصوص جگہ کا سختی سے خیال رکھیں' ایک افسر نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا'

"کل تم لوگ منجکا کیمپ سے رخصت ہو جاؤ گے اور تمہاری ذمہ

داری عالمی ریڈ کراس کے نمائندوں کے حوالے ہو جائے گی، تمہیں فی الوقت کارلووک کے عبوری مرکز میں منتقل کیا جائے گا وہاں سے بعد میں تمہیں کسی تیسرے ملک میں بھیجا جائے گا جہاں تمہیں اس جنگ کے اختتام تک رہنا ہو گا' کل روانگی سے قبل تمہیں اس نوع کی ایک تحریری رضامندی کے کاغذ پر دستخط کرنے ہوں گے' اس وقت تم جس ترتیب سے کھڑے ہو اسی ترتیب سے تمہیں بسوں میں سوار کر دیا جائے گا' اب تم اپنی کوٹھڑیوں میں واپس جا سکتے ہو"۔

یہ آواز' قیدیوں کے کانوں میں ایک خوشگوار تاثر چھوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی' یوں لگتا تھا جیسے بد قسمتی کے شگونوں والے سیاہ پرندے انہیں چھوڑ کر یک دم کہیں پرواز کر گئے ہوں۔ بالآخر کسی زبان سے وہ لفظ ادا تو ہوئے جن کا دو مہینوں سے انتظار کر رہے تھے۔ ان کی دبی ہوئی پژمردہ امیدیں جیسے یک دم زندہ اور تابندہ ہوگئی تھیں خوشی اور ذہنی انتشار کا ملا جلا تاثر ان کے چہروں پر کچھ اس طرح بکھرا ہوا تھا جیسے وہ جہنم کے سب سے گہرے منطقے سے ابھی ابھی نکل کر آئے ہوں۔ جیمو کو سر سے لے کر پاؤں تک اپنے جسم میں ایک خوشگوار سی لرزش اور سنسنی سفر کرتی محسوس ہوئی جبکہ محرم کی مسکراہٹ روکے نہیں رک رہی تھی۔

باڑے میں واپسی پر سکریجہ پٹالووچ نے، جو فٹ بال کا مشہور ریفری تھا اور جیمو کے ساتھ تاش کھیلا کرتا تھا' جیمو اور محرم کو محبت سے تھپتھپایا اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا!

"میرے دوستو اگرچہ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ مجھے رہائی نہیں مل رہی لیکن تمہاری آزادی کی جس قدر مجھے خوشی ہے اس کا اظہار میرے بس

سے باہر ہے' ممکن ہے ہماری باری بھی جلدی آجائے' کم از کم حالات بالآخر بدلنا شروع ہوئے ہیں۔

محرم نے فرطِ مسرت سے روتے ہوئے کہا'

"مجھے اب تک یقین نہیں آرہا کہ یہ سب کچھ واقعی ہو رہا ہے اور میں خواب نہیں دیکھ رہا یوں لگتا ہے جیسے میرا دل میرے جسم سے اچھل کر باہر نکل آئے گا"

اس رات وہ ایک پل نہیں سو سکے۔ رمیف اور فکو باورچی خانے سے رخصت کی تیاری کرنے والے ساتھیوں کے لیے بہت سا کھانا اور پھل لے آئے تھے اگرچہ وہ خود ان خوش نصیبوں میں (کم از کم فی الحال) شامل نہیں تھے' وہ دھیمی آواز میں دیر تک گیت گاتے رہے۔ صبح سویرے ناشتے کے فوراً بعد جانے والوں نے اپنا اپنا سامان باندھ لیا۔ جیمو نے ہر جانے والے کو فرداً فرداً خدا حافظ کہا۔ فکو سے جدا ہونا سب سے کڑا امتحان تھا' جیمو نے اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر اس کا کانپتا ہوا جسم اور بہتے ہوئے آنسو اس کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کر رہے تھے۔

جیمو نے مڑ کر بیرونی دروازے کی طرف چلنا شروع کیا جہاں لوگ ترتیب کے مطابق اپنی اپنی جگہوں اور قطاروں میں کھڑے ہو رہے تھے' جب سب لوگ آچکے تو کیمپ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل بوزیدر پاپووچ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا'

"مجھے امید ہے کہ ہم آئندہ بھی ملیں گے لیکن یہ ملاقات کافی کے پیالے یا جام شراب کے ساتھ ہوگی' میری خواہش ہے کہ تمہیں دوبارہ یہاں نہ آنا پڑے۔ کوشش کرنا کہ آئندہ کبھی تمہیں یہاں یا اسی طرح کے کسی

اور کیمپ میں نہ آنا پڑے کیونکہ عین ممکن ہے کہ دوسری بار خوش نصیبی تمہارا ساتھ نہ دے' اب تم کسی غیر ملک میں جا رہے ہو لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ اس احمقانہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک نہ ایک دن تم ضرور واپس اپنے وطن آؤ گے۔ جنگ انتہائی بے معنی چیز ہے لیکن یہ سدا جاری نہیں رہ سکتی ..... خدا تمہارا حامی و نگہبان ہو"۔

سپاگا نے' جو ان کا نگران افسر تھا' ایک ایک کر کے پھر سے قیدیوں کے نام پکارنے شروع کئے جس کا نام لیا جاتا وہ کیمپ کے مرکزی دروازے سے باہر ترتیب وار کھڑی بسوں میں سوار ہوتا جاتا' جیمو چھ نمبر بس میں تھا جبکہ محرم کی بس اس سے چار بسیں پیچھے تھی' کل چودہ بسیں تھیں جن میں تقریباً "سات سو قیدی سوار تھے' یہ وہ لوگ تھے جو کچھ ہی دیر بعد "سابق قیدی " بننے والے تھے۔

جیمو نے ایک تشویش بھرے انداز میں اپنی سیٹ سنبھالی جیسے اسے ابھی تک یقین نہ ہو کہ یہ بس واقعی اسے آزاد فضاؤں میں لے جا رہی ہے۔ سب کو سگرٹوں کا ایک ایک پیکٹ ،خوراک کا ڈبہ اور کچھ پھل بطور زاد سفر دیئے گئے۔ یہ چیزیں اس سامان کے علاوہ تھیں جو فنکو اور رمیض نے ان کے لیے باورچی خانے سے چرایا تھا۔ زیادہ کمزور لوگوں کے اوڑھنے کے لیے بالکل نئے کمبل تمام سیٹوں پر تہہ کر کے رکھ دیئے گئے تھے' ریڈ کراس کے لوگوں کی بھرپور توجہ اور پھرتی کی کھل کر تعریف نہ صرف بسوں میں سوار ہونے والوں نے کی بلکہ ان لوگوں نے بھی اس کی داد دی جو خاردار تاروں کی باڑ سے ادھر کیمپ میں باقی رہ گئے تھے اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

جیمو والی بس میں صرف ایک فوجی' ڈرائیور کے داہنے ہاتھ کی سیٹ پر بطور محافظ بیٹھا تھا جو بیس سال سے بھی کم عمر کا لگتا تھا وہ آرام سے پھیل کر بیٹھا تھا اور اس کی بندوق اس کے پاس ہی پڑی تھی بس کے چلتے ہی اس نے جیمو اور دوسرے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا'

"چند لمحوں بعد تم لوگ آزاد ہو گے' جہاں تک میرا تعلق ہے میری طرف سے تم اس وقت بھی آزاد ہو' مزے سے بیٹھو باتیں کرو' سگرٹ پیو۔ نووسکا سے پہلے البتہ تمہیں بس سے اترنے کی اجازت نہیں ہوگی"۔ جب بس کنٹین کے قریب سے گذری تو جیمو نے فکور میفں اور کچھ دوسرے قیدیوں کو باورچی خانے سے اپنی طرف ہاتھ ہلاتے دیکھا

"میرے دو بیٹے ابھی تک وہیں ہیں" جیمو سے پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "میں نے ان سے کہا بھی کہ وہ مجھے رکھ لیں اور ان کو جانے دیں' مگر وہ نہیں مانے"

جیمو نے مڑ کر کیمپ اور اس میں رہ جانے تمام لوگوں پر نظر ڈالی۔

وہ جنگل اور درختوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی اسی کچی سڑک پر روانہ تھے جو انہیں امارسکا سے یہاں لائی تھی اور جو پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اس مرکزی شاہراہ تک پہنچتی تھی جو بنجالوکا کی طرف جاتی ہے ' بسوں کے اس قافلے کے آگے آگے ریڈ کراس کے عالمی ادارے کی ایک گاڑی چل رہی تھی جس کی چھت پر اس کا سرخ رنگ کا بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بڑی سڑک پر پہنچنے سے پہلے ایک دوراہے پر ان کی بس ایک فوجی تفتیش گاہ پر پہنچی اور ایک ایسے مکان کے سامنے رکی جہاں کچھ لوگ پسائی کا کام کر رہے تھے ان کے چہروں کی ناراضی صاف بتا رہی تھی کہ وہ ان مسافروں کو

دیکھ کر خوش نہیں ہوئے

"یہ کسی سرب فوجی کے لیے مرجانے کا مقام ہے ..... لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں ..... کوئی پوچھے کہ آخر اس جنگ کی کیا ضرورت تھی؟"

جیمو والی بس کا محافظ' نوجوان فوجی جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا جبکہ مسافر بس کے دوبارہ چلنے کے انتظار میں سخت بے چین ہو رہے تھے' خدا خدا کر کے بس چلی اور اس سے پہلے کہ وہ صحیح طرح سے جان پاتے وہ ایک ذیلی سڑک کے ذریعے بنجالوکا شہر سے گذر رہے تھے' بازار لوگوں سے بھرے پڑے تھے کچھ کے خوفزدہ چہرے اور باقیوں کی فوجی وردیوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ شہر پر اصل قبضہ کس کا ہے!

محافظ سپاہی دریائے سیوا کے پل سے کچھ پہلے بوسانسکا گریڈسکا کے مقام پر اتر گیا چوک میں ان بسوں کے ساتھ اقوام متحدہ کی خصوصی فوج کے سپاہی شامل ہو گئے انہوں نے نیلے ہیلمٹ پہن رکھے تھے اور ان کی وردیوں پر "اقوام متحدہ" کا نشان نمایاں تھا تقریباً" بیس میل تک کروشیا کے لٹے پٹے دیہاتوں سے گذر کر وہ نووسکا پہنچ گئے جہاں پہنچ کر فوجی دستہ بڑی شاہراہ کے ساتھ واقع ایک بہت بڑے گاڑیاں کھڑی کرنے کے مخصوص علاقے کی طرف مڑ گیا۔ قریباً" پچاس گز دور سڑک کے ساتھ ساتھ بسوں کی ایک اور طویل قطار لگی تھی' انہیں ریڈ کراس کے لوگوں کی نگرانی میں گروپوں کی شکل میں اتار کر ان دوسری بسوں میں سوار کرایا گیا۔

"اب تم صحیح معنوں میں آزاد ہو' ان کے راہبروں نے اپنی نگرانی میں نئے نئے آئے ہوئے لوگوں کی خوشیوں میں شامل ہوتے ہوئے انہیں بتایا۔

"حالانکہ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا پھر بھی میرا جی چاہ رہا ہے

کہ انہیں گلے لگا لوں" کسی نے کہا بالآخر وہ ایک نہ نظر آنے والی حد فاصل کو عبور کر کے دوبارہ زندگی میں داخل ہو گئے تھے' وہ خوشی میں سسکیاں بھرتے اور چیخیں مارتے ایک دوسرے سے یوں لپٹ رہے تھے جیسے برسوں کے بچھڑے مل رہے ہوں۔ مسرت اور انبساط کی ایک برقی لہر ان کے جسموں میں رواں دواں تھی جس سے ان کے چہرے چمک اٹھے تھے۔ خوشی کے آنسوؤں کے سمندر میں غم والم کے تمام نشانات ڈوب کر گم ہو گئے تھے۔ فرط مسرت سے جیمو کا جسم لرز رہا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

اس نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور چھلانگ مار کر ایک بس میں سوار ہو گیا' اخباری نمائندے اور مختلف ٹی وی کے چینلز کے عملے ایک ہجوم کی صورت میں وہاں جمع تھے' بس میں لگے ریڈیو پر جیمو نے تازہ خبریں سنیں

"آج سرب حکام نے بد نام زمانہ منجکا کیمپ سے سات سو چالیس قیدیوں کو رہا کر دیا ہے' جیمو بس سے باہر نکل آیا' محرم نے اپنے دونوں بازو ہوا میں بلند کرتے ہوئے اس سے کہا

"جیمو کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے؟---- میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر اتنی طاقت سے چیخوں کہ میری آواز دریائے سیوا کے دوسرے کنارے اور اورونا تک ...... بلکہ اس سے بھی آگے جا سکے۔ جیمو نے ایک سسکی بھری اور مڑ کر کوزارا پہاڑی کی طرف دیکھا' اس کی آنکھیں فاصلوں کی دوری میں بھٹکنے لگیں اور ان میں ایک گہری حسرت کا تاثر ابھرنے لگا اس نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی!

"وہ ہے میرا پیارا پریجیڈور' شائد ہی کسی اور کو اس جگہ سے' مجھ سے

زیادہ پیار ہو ..... میں واپس آؤں گا' میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے تم ہی میرا نعرۂ جنگ ہو ......"

اس نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے رخسار پر آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا' سر اٹھایا اور دونوں ہاتھوں کو التجا اور دعا کے انداز میں جوڑتے ہوئے چلایا۔

"اے خدا ---- ان ظالموں کو کبھی معاف نہ کرنا"

اب اس کے بعد کیا ہو گا؟

وہ جنہوں نے رات کو زخمی کیا ہے ...... دن کو پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں!

کیا یہ لوگ جھوٹ موٹ ہی سہی ---- پچھتاوا محسوس کر سکیں گے؟

اس وقت کیا ہو گا جب یہ اپنے اس احساس برتری کی خام خیالی سے باہر نکلیں گے؟

اس وقت یہ کس طرح کے خواب بنیں گے؟

کیا وہ تمام بچے جو ان کے ہاتھوں زخمی اور اپاہج ہوئے یا مارے گئے کبھی ان کے اپنے بچوں کی زبان سے' ان سے ہم کلام ہوں گے؟

جب یہ زہریلا اسلحہ ان سے لے لیا جائے گا تو کیا بے بنیاد نفرت کی یہ تلچھٹ ہمیشہ کے لئے ان کے احساس کی چھلنی سے چھن کر نکل جائے گی؟

کیا کبھی انہیں پتہ چل سکے گا کہ اپنے جن بہادروں کو وہ بعد از مرگ ان کی اعزازی نشانات والی فوجی وردیوں سمیت دفن کرتے ہیں ان کے ماتم کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

کیا یہ کبھی اپنوں کی قبروں پر کھڑے ہو کر اپنے بچوں کو انتقام سے باز

رہنے کا سبق دے سکیں گے؟

کیا انصاف کی لگن، جو ہر آدمی میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے، اب بھی ان کے اندر کہیں موجود ہے؟

میں ان ہزاروں لاکھوں میں سے ایک ہوں جس نے ایک نہ ختم ہونے والی مسلسل اذیت صبح وشام برداشت کی ہے، جس کی انتڑیوں نے بندوق کی نال کی گرم چوٹیں سہی ہیں اور جس کے جسم کی کھال ان کے ڈنڈوں سے بار بار ادھڑتی رہی ہے۔

میں ان ہزاروں میں سے صرف ایک ہوں جو اپنے دل کی انتہائی گہرائی میں ایک بھاری بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے جس پر مندمل ہوتے ہوئے زخموں کے خوفناک نشان ہیں۔

اس امید پر کہ ایک وقت آئے گا جب یہ داغ دھل جائیں گے اور ان کے نشانات مٹ جائیں گے۔

ناول ملکیت و بشکریہ

محمد سعید چوھدری

ناول

سکین

بائے

محمد سجاد بھٹی

03045503086

خصوصی تعاون: جاسوسی نشست ایڈمن



ڈاکٹر حامد حسن، ممتاز علی کیانی، عقیل قریشی

محمد سجاد بھٹی، سیف الملوک عباسی، یاسر حسنین

ساگر زمان، ناصر محمود بلوچ